

وہ جو قرض رکھتے تھے

فرحتِ اشتیاق

www.paksociety.com

وہ جو قرض رکھتا تھا

”اتنی چپ کیوں بیٹھی ہو فری؟“ اسے یوں تنہا اور خاموش بیٹھا دیکھ کر ان کا دل بے حد اداس ہوا۔

وہ جواب میں کچھ بولے بغیر خاموشی سے ان کا منہ دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر پھیلا خوف اور سراپیمگی ان کے دل کو مزید دکھی کر گئی۔

اپنا دکھ بھلائے وہ سارا سارا دن اس کے ساتھ ہنسنے ہنسانے اور باتیں کرنے کی کوشش کرتی تھیں، مگر وہ آنکھوں میں اجنبیت اور خوف لیے ان سے کچھ بھی کہنے کی سعی نہ کرتی تھی۔

”پارک چلو گی؟“

وہ زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ وہ کسی روبروٹ کی طرح مشینی انداز میں ان کے ساتھ چلنے لگی۔ پچھلے ایک مہینہ سے وہ یہاں اسی طرح رہ رہی تھی۔ وہ کھانے کو کہتیں تو کھانا کھالتی۔ وہ اسے سونے کے لیے ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے آتیں تو خاموشی سے بستر پر لیٹ جاتی۔ وہ اسے کہیں تفریح

کے لیے لے جاتیں وہ چپ چاپ چلی جاتی۔ پھر چاہے وہ کتنی ہی اچھی اور بچوں کی دلچسپی کی جگہ کیوں نہ ہوتی، وہ بغیر کسی دلچسپی کے سپاٹ چہرے کے ساتھ وہاں ان کے ساتھ گھومتی۔ ان کی بہت کوششوں کے باوجود بھی اس کی خاموشی، خوف اور اجنبیت ختم ہو کر نہیں دے رہی تھی۔

وہ یونہی اس کا ہاتھ تھامے گیٹ سے باہر نکل آئی تھیں۔ وہ بے دھیانی میں ان کی باتیں سن رہی تھی جب سامنے سے سائیکلوں پر آتے پانچ چھ لڑکوں کو دیکھ کر ایک دم کچھ ڈر کر ان کے مزید قریب ہو گئی۔

تین چار دن پہلے بھی پارک جاتے ہوئے اس نے ان ہی لڑکوں کو دیکھا تھا اس کو وہ سارے کے سارے ہی بڑے بد تمیز اور شرارتی سے لگے تھے۔ خاص طور پر ان میں سے ایک لڑکا جو سب سے زیادہ

شور مچاتا ہو اور دونوں ہاتھ چھوڑ کر سائیکل چلا رہا تھا، اسے وہ سب سے زیادہ برا لگا تھا۔ اس روز بھی ان لوگوں کی بے ہنگم چیخوں اور شور سے ڈر کر وہ نانی امی کے قریب ہو کر چلنے لگی تھی تب پتا نہیں کیسے وہ لڑکا

اس کا ڈرنا اور نانی اماں کے قریب ہو جانا بھانپ گیا تھا اور پھر اپنے دوستوں کے غول سے سائیکل نکال کر وہ ایک دم تیزی سے سائیکل اسی کے پاس کچھ اس انداز سے بیچتا ہوا لایا تھا جیسے اس کے پیروں پر سائیکل

چڑھانے کا ارادہ رکھتا ہو۔ اس کے منہ سے بلکی سی چیخ نکلی تھی اور وہ توجہ نہ لگا تا آگے بڑھ گیا تھا۔ اس کے دوست بھی اس کی اس شرارت پر زرد زور سے ہنس رہے تھے۔ نانی امی تو پتا نہیں اپنے کس دھیان میں

تھیں کہ انہوں نے ان لڑکوں کے شور پر کچھ توجہ دی تھی اور نہ ہی اس لڑکے کے ایک دم سائیکل قریب لانے کا نوٹس لیا تھا۔ آج بھی ان لڑکوں کا ویسا ہی انداز تھا۔ عجیب سا دائرہ بنا کر وہ لوگ سائیکل گنا

کرتے تھے اور وہ لڑکا جو غالباً ان کا گروپ لیڈر تھا، ہاتھ چھوڑ کر سائیکل چلانے پر خود کو کوئی پھنسنے خان قسم کی چیز سمجھتا تھا۔ وہ لوگ شور مچاتے آگے بڑھ گئے تھے جب کہ وہ نانی امی کے ساتھ پارک کی طرف

جانے والی سڑک پر مڑ گئی تھی۔ پارک میں سارا وقت وہ بے دلی سے ایک بیخ پر بیٹھی رہی ایک گھنٹے بعد وہ دونوں واپس آئیں تو نانا بابا کے دوست واپس جا چکے تھے اور اب وہ لاؤنج میں بیٹھنے ٹی وی دیکھ رہے

تھے۔ نانی امی سے تو صرف اجنبیت محسوس ہوتی تھی لیکن نانا بابا سے تو اسے ڈر لگا کرتا تھا۔ حالانکہ انہوں نے اتنے دنوں میں کبھی ایک بار بھی اسے کچھ نہیں کہا تھا۔ مگر پھر بھی وہ ان سے ڈرتی تھی۔ جس جگہ وہ

ہوتے وہ خود بخود وہاں سے ہٹ جایا کرتی۔ اس سے کچھ کہتے نہیں تھے لیکن اسے دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں عجیب سا کھر دراپن اور بیگانگی چھلکے لگتی تھی۔ نانی امی ان کے پاس ہی بیٹھ گئی تھیں اور اسے

بھی ہاتھ پکڑ کر اپنے برابر میں بٹھالیا۔ وہ بیٹھ تو گئی تھی مگر نانا بابا کی خود پر پڑنے والی اجنبی نگاہوں سے

ہمیشہ کی طرح سہم گئی تھی۔ پتا نہیں کبھی کبھی ان کی آنکھوں میں نفرت کیوں نظر آتی تھی۔ وہ سر جھکائے
 ذری ہوئی بیٹھی تھی۔

”جاؤ بیٹا! منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جاؤ۔ پھر ایک گلاس اپیل جوس پینا ہے۔ اسلم ہوگا لیکن میں اس سے
 لے لینا۔“

وہ ہر ممکن کوشش کر رہی تھیں کہ وہ اس گھر کو اپنا گھر سمجھ کر رہنے لگے۔ یہاں کے لوگوں اور یہاں کی تمام
 چیزوں کی عادی ہو جائے۔ گواہ تک اپنے اس مقصد میں وہ کامیاب نہ ہو سکی تھیں مگر ابھی ہمت نہیں
 ہاری تھی۔

”میں سوچ رہی ہوں فریا کو کسی سائیکل ٹرسٹ کو دکھاؤں اتنے دن ہو گئے ہیں۔ اب تک وہ بالکل پہلے
 دن والی ہی کیفیت میں ہے۔ ویسے ہی سوتے میں ڈر جاتی ہے۔ پھر ماما ماما کر کے رونا شروع کر دے گی۔
 میں اٹھاؤں گی تو اٹھتے ہی میری شکل دیکھ کر ایک دم چپ ہو جائے گی۔ وہ حادثہ اس کے ذہن پر نقش
 ہو گیا ہے، بھول نہیں پارہی ہے وہ اس واقعہ کو۔“

اس کے اٹھتے ہی انہوں نے تانا ابا سے اپنی پریشانی بیان کی تھی۔

انہوں نے جواب میں صرف سر ہلا دیا۔



آج نانی امی نے اسے ڈرائیور کے ساتھ قریبی پیرا سٹار بھیجا
 ”اپنی پسند کی چاکلیٹس اور آئس کریم خرید کر لے آؤ۔“ انہوں نے اس کے ہاتھ میں پیسے دیتے
 ہوئے کہا۔

ڈرائیور اس کے پیچھے پیچھے پھر رہا تھا۔ کتنی دیر ہو گئی تھی اس نے کوئی چیز پسند نہیں کی تھی کچھ عاجز آ کر
 ڈرائیور مختلف خانوں میں سبکی انواع واقسام کی چاکلیٹس، بسکٹس اور فریزر سے نکال نکال کر مختلف آئس
 کریمز دکھانے لگا۔ اس کی کوفت زدہ شکل دیکھ کر اس نے ان میں سے دو تین چیزوں کے لیے ہابی
 بھری۔ وہ شکر ادا کرتا تیزی سے کاؤنٹر کی طرف پے منٹ کرنے چلا گیا تھا۔

وہ بھی آہستہ قدموں سے چلتی اس کے پیچھے جانے لگی تھی کہ تب ہی اچانک اسے کسی چیز سے ٹھوکر لگی
 اور وہ ایک دم توازن قائم نہ رہنے کی وجہ سے زمین پر گر گئی۔

بے ساختہ اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا، وہ اس کے سامنے کھڑا بڑی ڈھنائی سے مسکرا رہا تھا۔ اگر وہ

غائب و ماضی سے نہ چل رہی ہوتی تو اسے دیکھ کر ضرور محتاط ہو جاتی۔ اس نے جان بوجھ کر اپنی ٹانگ اس کے پاؤں سے ٹکرائی تھی اور اب اس کے سر پر کھڑا سے گرا ہوا دیکھ کر زور زور سے ہنس رہا تھا۔

بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ ہاتھوں سے رگڑ رگڑ کر آنسو صاف کرتی وہ جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ وہ کبھی کوئی شرارت کر کے فرار نہیں ہوتا تھا اس لیے بڑے مزے سے کھڑا تھا جب کہ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

ابھی اسے گھر واپس آئے تھوڑی دیر ہی ہوئی ہوگی جب ملازم نے اسے اس کے کسی مہمان کی آمد کی اطلاع دی۔ وہ بوقت ہو کر اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔ وہ یہاں کسی کو جانتی ہی نہیں پھر اس کا یہاں کوئی دوست کہاں سے آ گیا۔

”تم نے نام نہیں پوچھا اس کا؟“ نانی امی بھی اس کے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔

”سعد نام بتا رہا ہے۔ اسپورٹس سائیکل پر ہے۔ کہہ رہا ہے یہاں ایک بابر بی ڈول رہتی ہے۔ اس سے ملنا ہے۔“ وہ جواب میں کہتا ہوا ہنسنے لگا۔

”اپنی فریاءے بی کو کتنا پیارا نام دیا ہے اس بچے نے۔“ وہ اٹھ کر جانا نہیں چاہ رہی تھی، لیکن نانی امی نے اسے جانے کو کہا۔

ان کے اصرار پر وہ ملازم کے ساتھ ہی چلتی ہوئی باہر آئی وہ سائیکل ایک طرف کھڑی کیے چوکیدار کے ساتھ گفتگو میں مشغول تھا۔

وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ بدتمیز لڑکا یہاں گھر تک آ جائے گا اندر سے باہر تک آتے آتے اس نے بس یہی سوچا تھا کہ پتا نہیں کون ہے جو اس سے ملنا چاہتا ہے ابھی تھوڑی دیر پہلے جو حرکت وہ اس کے ساتھ کر چکا تھا اس کے بعد یہاں آنا ہٹائی کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ اسے آتا دیکھ کر وہ دوستانہ انداز میں مسکراتا آگے بڑھا۔

”میں سعد منیر ہوں۔“ اس کے غیر ملکی خدو خال دیکھ کر ہر کوئی اس سے انگریزی میں مخاطب ہوا کرتا تھا اور ایسا ہی اس نے بھی کیا تھا۔

اپنا تعارف کر داتے ہوئے اس نے اپنا دایاں ہاتھ اس کی طرف بڑھایا اس نے ہاتھ ملانے کے لیے اپنا ہاتھ آگے نہیں کیا۔

”مجھے پتا ہے تم مجھ سے ناراض ہو اس لیے ہاتھ نہیں ملا رہی ہو۔“ وہ اپنا بڑھا ہوا ہاتھ پیچھے ہٹا کر

ہوئے بولا۔

”میں اصل میں تم سے ایکسکپوز کرنے آیا ہوں، میں نے تو یونہی شرارت کی تھی مگر تم رو پڑیں۔ مجھے بہت افسوس ہوا۔“ وہ کچھ شرمندہ سے لہجے میں بولا۔

”میری عادت ہے شرارتیں کرنے کی۔ میں سمجھ رہا تھا، تم اس حرکت پر مجھ سے لڑو گی۔ برا بھلا کہو گی۔ مگر تم نے تو بجائے لڑنے کے رونا شروع کر دیا، بس اسی بات پر تمہیں سوری کہنے آیا ہوں۔ تمہیں میں نے پہلے بھی تین چار مرتبہ پارک آتے جاتے دیکھا ہے۔ یہیں اگلی لین (Lane) میں تو میرا گھر ہے۔“ وہ بڑی سنجیدگی سے معذرت کر رہا تھا۔ مگر جب وہ اس کے معذرت نامے کے جواب میں بھی کچھ نہیں بولی تو وہ چڑسا گیا۔

”تم کیا گوئی ہو؟“ غالباً اس سے زیادہ دیر تک وہ ادب و آداب کے دائرے میں رہ نہیں سکتا تھا۔ وہ بغیر اس کی بات کا جواب دینے اندر جانے کے لیے مزگی۔ اس بد تمیز لڑکے اور اس کی معذرت کو وہ کوئی اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں تھی۔ ملازم سے بھی اس نے آئندہ اس لڑکے کو گیٹ سے ہی لونا دینے کے لیے کہہ دیا تھا مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ جس سے وہ اپنے گھر پر ملنے سے انکار ہی ہو چکی ہے وہ اسے اسکول میں روز ملا کرے گا۔

اپنے اسکول کے پہلے ہی دن وہ اسے وہاں پر دیکھ چکی تھی، خود اس کی نظر فریاد پر نہیں پڑی تھی۔ وہ اس کے نہ دیکھنے پر سکون سا محسوس کر کے جلدی سے کلاس میں چلی گئی تھی مگر اسی روز چھٹی کے وقت جب وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ رہی تھی تو وہ بھی ان کے پیچھے والی گاڑی میں بیٹھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور لڑکا بھی تھا۔ جو عمر میں اس سے چھوٹا لگ رہا تھا۔ غالباً اس کا چھوٹا بھائی تھا، اپنی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے وہ بھی اسے دیکھ چکا تھا۔

نانی امی ڈرائیور کے ساتھ خود اسے لینے آئی تھیں، وہ بڑی تفصیل سے اس سے اسکول کی ایک ایک بات پوچھ رہی تھیں۔

”تھوڑے دن لگیں گے تمہیں سیٹ ہونے میں۔ پھر تم دیکھنا یہاں کا اسکول تمہیں اپنے میڈروالے اسکول سے بھی زیادہ اچھا لگے گا۔“ وہ اس کے چہرے پر پھیلی افسردگی دیکھ کر پیار سے سمجھانے لگیں۔ شام میں نانا بابا نے بھی سرسری سے انداز میں اس سے اسکول کے بارے میں پوچھا۔ ان کے مختصر سوالوں کا اس نے بہت مختصر لفظوں میں جواب دیا۔

اس نے کلاس میں کسی سے بھی دوستی کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ دو تین لڑکیوں نے از خود اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا مگر اس کی سرد مہری اور خاموشی دیکھتے ہوئے خود ہی پیچھے ہٹ گئی تھیں۔ اسے نہ تو اسکول سے کوئی دلچسپی تھی نہ دوستی سے اور نہ ہی پڑھائی سے، نانی امی اسے اسکول بھیجتیں اور وہ بیک لڑکائے اسکول آ جاتی۔ حالانکہ پہلے وہ بہت ذہین اور محنتی طالبہ تھی۔ اگر اس کے موجودہ ٹیچرز کو یہ بات بتائی جاتی کہ فریا عبدالرحمن 5th گریڈ تک ہر کلاس میں پہلی پوزیشن لیتی رہی ہے اور نہ صرف پڑھائی میں بلکہ دیگر غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی اس نے ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے اور ہمیشہ ہی انعامات بھی جیت کر لاتی ہے تو وہ اس بات پر یقین کرنے سے انکار کر دیتے۔

مارے باندھے ہوم ورک کرنے والی فریا عبدالرحمن کلاس کی سب سے ڈل اور ڈفر اسٹوڈنٹ کہلائی جاسکتی تھی۔ سعد سے اس کا اسکول میں کئی مرتبہ آمانا سامنا ہوتا مگر نہ تو اس نے اب اس کے ساتھ کوئی بد تمیزی کی تھی اور نہ ہی اس سے بات کرنے ہی کی کوشش کی تھی۔ وہ ایسے دیکھ کر لائق سے گزر جاتا تھا ایسے جیسے جانتا ہی نہ ہو۔ وہ ان سے دو کلاس آگے یعنی 8th گریڈ میں تھا۔ اسکول میں بھی اس کی داد گیری تھی سینئر اسٹوڈنٹس جو اس سے عمر اور قد و قامت میں کافی بڑے تھے وہ بڑے آرام سے ان سے لڑائیاں مول لیا کرتا تھا۔ اور مزے کی بات یہ تھی کہ ایسے جھگڑوں میں جیتا بھی کرتا تھا۔

اس روز وہ چھٹی کے بعد گیٹ کے پاس نئی سٹی بیچ پر بیٹھی اپنی گاڑی کا انتظار کر رہی تھی، چھٹی ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی اور ڈرائیور ابھی تک نہیں آیا تھا، اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ چھٹی کے وقت ڈرائیور موجود نہ ہو۔ پہلی مرتبہ ایسا ہوا تھا اور وہ اچھی خاصی پریشان ہو گئی تھی۔ کافی سارے بچے جا چکے تھے گیٹ کی طرف جاتے ہوئے سعد نے اسے روکھی سی شکل بنائے بیچ پر بیٹھے دیکھا تو خود کو اس کے پاس آنے سے روک نہیں پایا۔

”کیا ہوا تمہیں کوئی لینے نہیں آیا؟“ اس نے سزا بھا کر اپنے پاس کھڑے سعد کو دیکھا اور بے ساختہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”اب میں گھر کیسے جاؤں گی؟“ وہ روتے روتے بولی۔

”اتنی سی بات پر رو رہی ہو۔ اگر کوئی لینے نہیں آیا تو تم ہمارے ساتھ چلنا۔ ہم تمہیں ڈراپ کر دیں گے۔“ وہ بہت پر خلوص انداز میں بولا۔

”تم ٹھہرو میں اپنے بھائی کو تھوڑی دیر انتظار کرنے کے لیے کہہ آؤں۔“ وہ اس سے کہتا ہوا گیٹ سے

جس کو آواز دلا گیا۔
خاکل ہلکی ہوئی۔

باہر کھڑی اپنی گاڑی میں بیٹھے بھائی اور ڈرائیور کو کچھ دیر رکنے کا کہہ کر واپس اس کے پاس آ گیا۔
”تم مجھے اپنے گھر کا فون نمبر دو، میں اندر آفس سے جا کر فون کر کے پتا کر لیتا ہوں۔“ وہ اس کے برابر
میں شیخ پر بیٹھ گیا۔

وہ روتے ہوئے فون نمبر بتانے لگی تھی اس نے نمبر کہیں نوٹ نہیں کیا تھا بلکہ اس کی زبانی نمبر سنتا ہوا فوراً
کھڑا ہو گیا تھا۔

ابھی وہ مڑا بھی نہیں تھا کہ فریاد اپنی گاڑی کا ہارن بیجان کر ایک دم خوشی سے اچھلتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔
”میری گاڑی آ گئی۔“ وہ بیگ اٹھاتے ہوئے پرسکون سی ہو کر بولی۔ وہ دونوں ایک ساتھ گیٹ سے
باہر نکلے۔ اپنی گاڑی کی طرف جاتے جاتے اسے میز زیاد آ ہی گئے۔
”تھینک یو۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کر تھوڑا سا مسکرائی۔

وہ اس کے پر تکلف سے شکر یہ پر نفس پڑا۔

وہ گاڑی میں بیٹھی تو ڈرائیور دیر ہو جانے پر معذرت کرتا گاڑی کے خراب ہو جانے کی داستان سنانے
لگا، وہ بے توجہی سے اس کی باتیں سنتی سعد کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

”سعد اچھا لڑکا ہے۔“ پہلی مرتبہ اس نے سعد کے بارے میں کوئی اچھی بات سوچی تھی۔

وہ بھری دھوپ میں سڑکوں پر اسکیٹنگ کرتا پھر رہا تھا۔ دوپہر میں سونا سے سخت ناپسند تھا۔ اسکول کھلے
ہوتے تو وہ دوپہر میں اپنا ہوم ورک وغیرہ کر لیا کرتا تھا جب کہ آج کل گرمیوں کی چھٹیوں کی وجہ سے یہ
مصرفیت بھی نہیں تھی۔ اس کے اکثر دوست چھٹیوں میں کہیں نہ کہیں گھومنے گئے ہوتے تھے خود وہ اپنی
فیملی کے ساتھ امریکہ اپنے رشتے داروں سے مل کر اور گھوم پھر کر واپس آ چکا تھا اور اب واپس آنے کے
بعد سے سخت بوریت محسوس کر رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ چھٹیاں ختم ہونے میں جو یہ ایک مہینہ باقی
ہے یہ گزرے گا کیسے؟ اس وقت بھی می اور زویب دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر سونے لیٹ گئے
تھے جب کہ وہ بوریت دور کرنے کے لیے گھر سے باہر نکل آیا تھا۔

فریاد کو سڑک پر ادھر ادھر کچھ تلاش کرتا دیکھ کر وہ چونکا تھا۔

اسے دوسرے بچوں کی طرح گھر سے باہر نکلنے اور کھیلنے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا اس لیے اسے دیکھ کر

حیران ہوا۔

”ہیلو...“ وہ اس کے پاس آ کر بولا۔ وہ نیم کے درخت کے پیچھے جھانک کر پتا نہیں کیا چیز دیکھ رہی تھی

اس کی آواز سن کر چونک کر مڑی۔

”ہیلو!“ جو باہر مسکراتے ہوئے اس نے بھی ہیلو کہا۔ اس روز کے بعد سے وہ سعد کے ساتھ اسکول میں آنا سامنا ہونے پر ہائے ہیلو کرنے لگی تھی۔

”کیا ڈھونڈ رہی ہو؟“ چوہنگم چباتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”کینڈی گھر سے باہر پتا نہیں کہاں نکل گئی ہے۔ اس کو ڈھونڈ رہی ہوں۔“ اس کے چہرے پر پریشانی چھائی ہوئی تھی۔ ”میری بلی کا نام ہے کینڈی۔“ اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتا اس نے خود ہی وضاحت بھی کر دی۔

”جائے گی کہاں یہیں کہیں ہوگی۔ چلو میں تمہارے ساتھ مل کر ڈھونڈ لیتا ہوں۔ تم یہ بتاؤ وہ ہے کس طرح کی، یعنی اس کی شکل صورت وغیرہ۔“ وہ آس پاس نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”وائٹ کلر کی ہے کینڈی اور بہت خوبصورت ہے۔ بہت سی بلیوں میں بھی الگ پہچان لی جاتی ہے۔ اس کا فر (Fur) اتنا نرم ہے اور دم بھی بالکل وائٹ اور بہت موٹی سی ہے اور آنکھیں....“ ابھی بلی کا قصیدہ آنکھوں تک ہی پہنچا تھا کہ اس کی آنکھوں سے ٹپاٹپ آنسو بہنے لگے۔

وہ جو بڑے غور سے بلی کا حلیہ سن رہا تھا اس کے ایک دم رو پڑنے پر حیران تو نہیں ہوا تھا البتہ غصہ بہت شدید آیا۔

”تم ہر بات پر اسی طرح روتی ہو۔ تمہاری کوئی بات بغیر روئے ہوتی ہے۔ گرگٹیں تو روؤ گی، گاڑی نہیں آئی تو روؤ گی اور کینڈی کھو گی تو روؤ گی۔ ایڈیٹ رونا ایسے شروع کیا ہے جیسے کسی مرحوم کی خوبیاں گناتے گناتے بندہ اچانک اس کے مرنے کا سوچ کر دوبارہ سے رونے لگتا ہے۔“ وہ روتے ہوئے اس کی ڈانٹ سن رہی تھی۔

”ڈھونڈتا ہوں تمہاری اس ہزاروں میں ایک کینڈی کو۔ اب یہ آنسو صاف کرو اور آواز بالکل بند ہو جانی چاہیے۔ نہیں۔ ابھی مجھے ہلکی سی سوسوں کی آواز آرہی ہے۔“ اس نے جلدی جلدی ہاتھوں سے آنسو صاف کیے اور بالکل خاموش بھی ہو گئی اور وہیں کھڑی اسے سڑک پر آگے جانا ہوا دیکھنے لگی۔ وہ آہستہ آہستہ اسکیٹنگ کرتا بیوروارد گرد دیکھتا ہوا دوسری گلی میں مڑ گیا۔ نانی اماں نے کتنی مہنگی اور خوبصورت بلی منگوا کر اسے دی تھی۔ تین مہینے سے وہ اس کے پاس تھی۔ اس کی فوراً ہی کینڈی سے دوستی ہو گئی تھی۔ نانی امی اسے کینڈی کے ساتھ کھیلتا دیکھ کر خوش تھیں۔

دس منٹ بعد اس نے سعد کو بڑی تیزی سے واپس آتا ہوا دیکھا، اس کی گود میں کینڈی کو دیکھ کر اس کی کب سے انکی ہوئی سانس بحال ہوئی۔

”یہ یو یہ رہی تمہاری حسین کینڈی۔ وہاں افتخار انکل کے گیٹ کے باہر ان کی بلیوں کے ساتھ بیٹھی پتا نہیں کیا نڈا کرات کر رہی تھی۔“ سعد نے اس کے پاس آ کر رکتے ہوئے کہا۔ فریڈ نے جلدی سے آگے بڑھ کر کینڈی کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

”تھینک یو سعد....“ وہ بہت تشکر آمیز لہجے میں بولی۔ اس نے لاپرواہی سے سر ہلاتے ہوئے جیسے اس کا شکر یہ بڑی شان بے نیازی سے قبول کیا۔

”ویسے تم نے کہا بالکل ٹھیک تھا۔ ان کی پانچ بلیوں کے ساتھ بیٹھی بھی یہ بالکل الگ الگ رہی تھی۔ تمہاری کینڈی واقعی خوبصورت ہے۔ بالکل تمہاری طرح۔“ وہ واپس مڑ کر اپنے گھر کی طرف چلنے لگی۔ سعد بھی اسکیٹنگ کرتا اس کے ساتھ ساتھ ہی چلنے لگا تھا۔ وہ اپنی اور کینڈی کی تعریف پر ہنس دی۔

”آؤ سعد! میں تمہیں اپنی نانی امی سے ملواؤں۔“ گیٹ کے سامنے رکتے ہوئے اس نے اسے اندر آنے کی دعوت دی۔ وہ بغیر کسی اعتراض کے اس کے ساتھ اندر آ گیا۔ اسے لاؤنج میں بٹھا کر وہ نانی امی کو بلانے چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر بڑے پر جوش سے انداز میں انہیں لاؤنج میں لے آئی۔ سعد نے انہیں دیکھ کر جلدی سے اٹھ کر سلام کیا تھا۔

”نانی امی! یہ سعد ہے۔ میرے اسکول میں پڑھتا ہے اور اس کا گھر بھی یہیں قریب ہی ہے۔“ اس نے کچھ فخریہ انداز میں تعارف کر دیا۔

شاید انہیں یہ باور کرانا چاہ رہی تھی کہ دیکھ لیں، میں نے ایک دوست بنا ہی لیا ہے۔ آپ سمجھتی تھیں میں کسی سے دوستی کر ہی نہیں سکتی۔ نانی امی اس کا انداز سمجھتے ہوئے ہنس پڑیں۔ سعد کے سر پر ہاتھ پھیر کر پیار کرتے ہوئے انہوں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ نانی امی اس سے رسمی قسم کی باتیں پوچھنے لگیں۔ اس کے پاپا کیا کرتے ہیں۔ وہ لوگ کتنے بہن بھائی ہیں، وہ کون سی کلاس میں پڑھتا ہے وغیرہ۔

”تمہارا دوست پہلی مرتبہ آیا ہے اور تم اس کی کچھ خاطر بھی نہیں کر رہیں۔“ نانی امی نے سعد سے باتیں کرتے کرتے اسے ٹوکا۔

سعد سے تو وہ اردو میں بات کر رہی تھیں۔ مگر فریڈ سے بھی یہ جملہ اردو میں کہا گیا تھا، وہ فوراً ہی سر ہلاتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئی تھی۔ سعد کے لیے اس کا اردو جاننا کافی حیرت انگیز تھا، براہ راست کچھ

پوچھنا تجسس کا اظہار کرنا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا مگر دل ہی دل میں حیران ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے جب اس نے دو تین مرتبہ فریا کو نانی امی کے ساتھ پارک جاتے ہوئے دیکھا تھا تو واضح طور پر ان دونوں کے درمیان رشتہ کا تعین نہیں کر پایا تھا۔ لیکن آج تو یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ وہ اس کی نانی ہیں۔ ایک مکمل پاکستانی خاتون اور فریا فارنز....

صرف شکل صورت ہی نہیں بلکہ وہ اپنے ہر انداز سے غیر ملکی لگتی تھی۔ ایسے جیسے یہاں کے لوگ یہاں کا رہن سہن سب اس کے لیے بالکل اجنبی ہیں لیکن اس کے کچھ پوچھنے بغیر انہوں نے خود ہی بعض باتوں کے بارے میں اس کی حیرت دور کر دی تھی۔

”فریا کے ماما پاپا کی ڈھچھ ہو گئی ہے۔ بس اس کی زندگی تھی جو یہ اس روز ان لوگوں کے ساتھ گاڑی میں نہیں تھی۔ لیکن اس حادثے نے اسے ذہنی طور پر بہت خوفزدہ اور اکیلا کر دیا ہے۔ اپنے ہنستے بولتے چاکلیٹس اور کھلونے لانے کا وعدہ کر کے جانے والے ماما پاپا کو واپس آنے پر جب اس نے مراہو دیکھا تو یہ اس صدمے کو برداشت نہیں کر پائی۔ ابھی تک یہ اس حادثے کو بھول نہیں پائی ہے۔ اس کے لیے ابھی تک جیسے یہ بات بڑی ناقابل یقین سی ہے کہ ماما پاپا اس کے لیے کھلونے اور چاکلیٹس لانے کے بجائے کہیں اور چلے گئے ہیں۔“ بولتے بولتے ان کی آواز کچھ بھرا سی گئی اس لیے وہ خاموش ہو گئی تھیں۔

سعد کو فریا کا بات بات پر رو پڑنا اور خوفزدہ ہو جانا سمجھ میں آنے لگا تھا۔ وہ دل میں اس کے لیے بہت مادکھ محسوس کرتے ہوئے خود بھی چپ بیٹھا ہوا تھا۔ فریا کو نرے اٹھائے لاؤنج میں آتا دیکھ کر نانی امی نے جلدی سے اپنے چہرے کے تاثرات کو نارمل کیا تھا۔ سعد بھی قصداً مسکرا دیا۔

”تمہیں اسٹراہیری فلیور پسند ہے نا۔“ وہ شیشے کا نازک سا آئس کریم کپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”بہت زیادہ پسند ہے، صرف آئس کریم نہیں بلکہ جیم بھی مجھے اسٹراہیری کا ہی پسند ہے اور اسٹراہیری کے شیک کی تو کیا بات ہے۔“ وہ کپ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے بولا۔

وہ اپنے پسندیدہ فروٹ کی اس کے منہ سے تعریف سن کر خوش ہو گئی تھی۔

آئس کریم ختم کرتے ہی سعد اٹھ گیا۔ وہ اسے چھوڑنے باہر تک آئی۔ ”خیال رکھنا اب یہ کہیں دوبارہ سے باہر نہ نکل جائے۔“ سعد نے بھی اس کی نانی امی کی طرح اس سے اردو میں کہا تھا۔

وہ اس کی بات سن کر اپنے ساتھ چلتی کینڈی کو دیکھ کر مسکرا دی۔

”سعد اتم اسکیننگ بہت اچھی کرتے ہو۔ میں نے ایک بار کرنے کی کوشش کی تھی۔ فوراً ہی گر پڑی تھی۔“

وہ گیٹ سے باہر نکلا تو اس کا تعریفی جملہ کانوں سے نکل آیا۔

”اور سائیکلنگ اچھی نہیں کرتا؟“ اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

”جو کر لگتے ہو ہاتھ چھوڑ کر سائیکلنگ کرتے ہوئے۔ ایسے کرتب تو جو کر دکھاتے ہیں۔“ وہ صاف گوئی سے بولی تو اس کا منہ بن گیا۔

”کتنے لڑکے میرے اس اسٹائل سے امپریس ہوتے ہیں، ہمیں پتا ہے۔“

”وہ امپریس ہونے والے بھی تمہاری طرح کے جوکر ہوں گے۔“ وہ اس کی بات پر بڑے اطمینان سے بغیر متاثر ہوئے بولی۔

”میں سوچ رہا تھا کہ تمہیں ان چھٹیوں میں اسکیننگ سکھا دوں گا۔ لیکن اب تو کبھی نہ سکھاؤں۔“ وہ منہ ہکا کر بولتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔ جب کہ وہ مسکراتی ہوئی واپس اندر آگئی۔



”فری!“ ماما سے آواز دے رہی تھیں۔ ”تمہاری فائن آرٹس کی ٹیچر تمہاری بہت تعریف کر رہی تھیں۔“ ماما اور پاپا دونوں اس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ”اس بار ہم فری کی برتھ ڈے بہت مختلف انداز میں منائیں گے۔“ پاپا نے مسکراتے ہوئے ماما سے کہا تھا۔ خدیجہ آنٹی کچن سے مسکراتی ہوئی نکلی تھیں اور ان لوگوں کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھیں۔

گاڑی بہت تیز رفتاری سے چل رہی تھی۔ پاپا گاڑی ڈرائیو کر رہے تھے۔ ماما ان کے برابر میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ”پہلے فری کے کھلونے لے لیتے ہیں۔ باقی شاپنگ بعد میں کریں گے۔“ ماما نے پاپا سے کہا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے سر ہلا دیا۔

اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوا تھا ماما پاپا خون میں نہائے گاڑی میں بے ہوش پڑے تھے۔

”فری! تمہارے ماما اور پاپا کو اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس بلا لیا ہے۔“ خدیجہ آنٹی نے روتے ہوئے اسے گلے سے لگایا تھا۔

”یہ تمہارے نانا ہیں فری۔“ وہ اسپتال کے بستر پر پڑی تھی۔ خدیجہ آنٹی نے ایک اجنبی صورت آدمی سے اس کا تعارف کروایا۔

”میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ میں ان کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ مجھے پاکستان نہیں جانا۔ میرے پاپا کو بلائیں خدیجہ آئی! میرے ماما پاپا کو بلائیں۔“ وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔

”فری! کیا ہو گیا ہے بیٹا! اٹھو شاباش آنکھیں کھولو۔“ کوئی بہت دور سے اسے آوازیں دے رہا تھا۔

بڑی مشکلوں سے روتے ہوئے اس نے آنکھیں کھولیں اپنے برابر میں بیٹھی نانی امی کو دیکھ کر وہ ایک دم چپ ہو گئی۔

انہوں نے اٹھ کر لائٹ آن کی اور پھر دوبارہ اس کے پاس آ گئیں۔ اسے خود سے لپٹا کر لیتے ہوئے انہوں نے اس پر کچھ پڑھ کر پھونکا۔

”نیند نہیں آرہی؟“ اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے انہوں نے آہستہ آواز میں پوچھا تو اس نے سر ہلا دیا، جس روز سے وہ یہاں آئی تھی نانی امی اس کے پاس ہی سوتی تھیں۔

ان کی اتنے دنوں کی مسلسل کوششوں کے نتیجے میں وہ ان سے کسی حد تک بے تکلف ہو گئی تھی۔ اب وہ اکثر ان کے ساتھ باتیں بھی کر لیا کرتی تھی۔ اس وقت بھی اس کا خوف دور کرنے کی خاطر وہ اس سے باتیں کرنے لگی تھیں۔



وہ بڑی خوشگوار حیرت میں گھری اپنی ماما کے بچپن کی تصویریں دیکھ رہی تھی۔

کل رات اس سے باتیں کرتے ہوئے نانی امی نے اس سے اس کے ماما پاپا کے بارے میں بہت ساری باتیں کی تھیں۔

شروع شروع میں اسے ماما اور پاپا کا نام سنتے ہی رونا آنے لگتا مگر اب وہ آنسو بہانے کے بجائے ان کے بارے میں باتیں سننا پسند کرنے لگی تھی۔ بڑا اچھا لگتا تھا اسے جب نانی امی اس کی ماما کا محبت سے ذکر کرتیں۔ ان کے لہجے کی محبت اور آنکھوں کی نمی شروع دن ہی اسے یہ بات بتا گئی تھی کہ جانے والی وہ ہستی جو اس کی ماں تھی وہ انہیں بھی اتنی بلکہ شاید اس سے کچھ بڑھ کر ہی عزیز تھی۔ وہ اسے ماما کے بچپن کی باتیں بتا رہی تھیں۔

”بڑی شرارتی تھی وہ۔ اس کی شرارتوں سے سب پناہ مانگا کرتے تھے۔ بہت ذہین اور حاضر جواب اس کے۔ نیچر تک اس کی حد درجہ ذہانت سے خائف رہا کرتے تھے۔ اور اپنے پاپا کی تو لاڈلی بیٹی تھی وہ۔ مجال ہے جو تمہارے نانا ابا اس کی کوئی فرمائش نال دیں۔ مجھے تو ذرا لگا رہتا تھا کہ کہیں ان کے بے جا لاڈ

پیار کی وجہ سے وہ ضدی اور سرکش نہ ہو جائے۔ مگر میری ان باتوں کی وہ دونوں ہی پروا نہیں کرتے تھے۔
ایسے باپ بیٹی تو میں نہیں کہیں دیکھے ہی نہیں۔ دونوں بالکل دوستوں کی طرح رہتے تھے۔

ہر گیم شرط لگا کر کھیلتے تھے۔ چاہے وہ کارڈز ہوں، شطرنج ہو یا کوئی آؤٹ ڈور گیم ہی کیوں ہو، اور وہ ضوفشاں اکثر گیمز بے ایمانی سے جیت لیا کرتی تھی اور تمہارے نانا ابا اس کی بے ایمانی فوراً پکڑ بھی لیا کرتے تھے۔ پھر دونوں میں بچوں کی طرح جھگڑا ہوتا تھا۔ نہ وہ اپنی بے ایمانی تسلیم کرتی تھی اور نہ یہ اس کی جیت آخر کار مجھے ہی امن کی فاختہ بنا پڑتا تھا۔ لیکن وہ دونوں منہ پھلائے ایک دوسرے سے ناراض یہ اعلان کرتے کہ آئندہ آپس میں کوئی کھیل نہیں کھیلیں گے۔ میں کہتی یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ نہ کھیلیں گے اور نہ پھر یوں بچوں کی طرح جھگڑیں گے۔ مگر حیرت تو مجھے تب ہوتی جب اگلے ہی روز وہ دونوں اپنے اپنے دعوؤں کی نفی کرتے دوبارہ کھیلنے کے لیے آمادہ نظر آتے۔

وہ یونیورسٹی میں آگئی تھی تب بھی ان کے ساتھ بالکل بچپن والے ہی انداز میں رہتی تھی۔ ویسے ہی بچپن کی طرح لاڈ اٹھواتی تھی۔ وہاں پر بھی اس کا وہی اسکول جیسا اسٹائل تھا۔ یونیورسٹی سے آ کر جب تک دن بھر کی روداد مجھے اور اپنے پاپا کو سنا نہیں لیتی، اسے چین نہیں آتا تھا۔ یونیورسٹی میں بھی وہ ہر دل عزیز تھی۔ اپنے ڈپارٹمنٹ کی سب سے ذہین اور جینٹل اسٹوڈنٹ، ہم دونوں کے پیچھے لگی رہتی تھی کہ آپ لوگ کبھی کمپس آئیں اور میرے ٹیچرز سے میرے بارے میں پوچھیں۔

”جرنلزم ڈپارٹمنٹ میں آ کر صرف ضوفشاں فاروق کا نام لیں نہ کلاس بتانے کی ضرورت پڑے گی نہ دیگر کوئی اور تفصیل اور سامنے موجود بندہ فوراً ہی سمجھ جائے گا کہ یہ ڈیگرگرس لڑکی کا مورہا ہے اور جب آپ اسے بتائیں گے کہ آپ میرے می پاپا ہیں تو دیکھیں گے وہ آپ دونوں سے بھی ایک دم ہی متاثر نظر آنا شروع ہو جائے گا۔ بڑی مشہور ہوں میں اپنے ڈپارٹمنٹ میں بلکہ پوری آرٹس فیکلٹی میں لوگ مجھے میری ذہانت کی وجہ سے بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔“

وہ گردن اگڑا کر یہ بات اتنے معصومانہ انداز میں بتاتی کہ ہم دونوں اس کے انداز پر پھر کتنی دیر تک بننے رہتے تھے۔ تمہارے نانا ابا اسے چڑانے کے لیے کہتے تھے ”اپنے منہ سے اپنی تعریفیں پتا ہے کون لوگ کرتے ہیں۔ سچی تعریف وہ ہوتی ہے جو کوئی دوسرا کرے اور وہ بھی بیٹھ پیچھے۔“

ہم تو اس روز مانیں گے جب ضوفشاں فاروق ایم اے جرنلزم فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن کی ڈگری بمع گولڈ میڈل کے ہمارے سامنے آ کر کھڑی ہوگی۔ اور وہ بڑے غزم سے یہ چیلنج قبول کر لیتی۔

وہ اسے اس کی ماما کے بارے میں کتنی ساری ایسی باتیں بتا رہی تھیں جو اس سے پہلے کبھی بھی اس کے علم میں نہیں آئی تھیں۔

اس نے اپنی زندگی کے دس سال ماما اور پاپا کے ساتھ گزارے تھے۔ نانی امی کہہ رہی تھیں کہ وہ بہت شرارتی تھیں لیکن اس نے تو انہیں بہت سنجیدہ اور سوبر سادہ دیکھا تھا۔ بڑی کم گوئی تھیں اس کی ماما۔ اس کی یادداشت اور نانی امی کا بیان دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ لیکن پھر بھی اسے ان باتوں میں بہت دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ باتیں اس کی ماما کی تھیں ان کے بچپن کی ان کے کالج اور پھر یونیورسٹی لائف کی باتیں تھیں اور انہیں سننا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اگلے روز نانی امی سے فرمائش کر کے اس نے ماما کی بچپن کی تصویریں نکلوائی تھیں۔

ڈھیر سارے الہمز اپنے ارد گرد پھیلانے وہ اپنی ماما کو ہنستا کھلکھلاتا ہوا بڑی محویت سے دیکھ رہی تھی۔ ہر تصویر میں وہ نانی امی کے مقابلے میں نانا ابا کے زیادہ قریب نظر آ رہی تھیں۔ واقعی ان دونوں کا انداز بالکل دوستوں والا لگ رہا تھا۔

وہ تصویروں میں نانا ابا کو ہنستا ہوا دیکھ کر بہت حیران ہو رہی تھی۔ جب سے وہ یہاں آئی تھی ہنستا تو دور کی بات اس نے انہیں باتیں کرتا ہوا ہی بہت کم دیکھا تھا۔ اس سے تو خیر وہ سوائے رسمی باتوں کے کوئی بات نہیں کرتے تھے مگر نانی امی سے بھی ان کی گفتگو یوں ہوا کرتی تھی کہ وہ اکیلی بولتی رہتی تھیں اور وہ سوائے کسی انتہائی جواب طلب بات پر کچھ بولنے کے گھنٹوں چپ بیٹھے انہیں سنتے رہتے تھے۔

وہ لان میں بیٹھی تصویریں دیکھ رہی تھی۔ اسی وقت پورچ میں آ کر گاڑی رکھی تھی۔ کھدیر بعد اس نے نانا ابا کو اندر جاتے دیکھا تو جو الہم اس کے ہاتھ میں تھا وہی اٹھا کر ان کے پیچھے بھاگتی ہوئی آئی۔ اس کا دل چاہا تھا کہ وہ نانی امی کی طرح نانا ابا سے بھی اپنی ماما کی باتیں سنے۔ ان کے پاس تو سنانے کے لیے اور بھی مزے مزے کی باتیں ہوں گی۔ وہ تو اس کی ماما کے بیسٹ فرینڈ تھے۔

اس نے ان ہی تصویروں میں سے ایک تصویر میں ماما کو نانا ابا کو ایک کار ڈر دیتے ہوئے دیکھا جس پر پورا جملہ پڑھا نہیں جا رہا تھا مگر My Best Friend لکھا ہوا ضرور نظر آ رہا تھا وہ یونہی بھاگتی ہوئی ان کے کمرے میں گئی۔ وہ ٹیلی فون پر کوئی نمبر ڈائل کر رہے تھے۔ اسے یوں بھاگ کر آتا ہوا دیکھ کر بے ساختہ رک گئے تھے۔

”دیکھیں نانا ابا! یہ تصویریں کتنی اچھی لگ رہی ہیں۔“ ان کے برابر میں بیٹھے ہوئے اس نے کھلے الہم

میں موجود پکنک والی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ انہوں نے صرف ایک نظر تصویر پر ڈالی اور فوراً ہی اپنی نظریں واپس ہٹالیں۔

وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ تصویر دیکھ کر خوب ہنسیں گے اور پھر اسے اس پکنک کے مزے دار واقعات سنائیں گے، مگر وہ تو عجیب سی سردی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

”میں اس وقت بہت ضروری فون کر رہا ہوں فرمایا۔“ چند لمحوں بعد انہوں نے اس پر سے نظریں ہٹا کر ریسیور دوبارہ اٹھا لیا تھا۔ وہ ان کے سر دوپاٹ سے انداز پر بد دل سی ہوتی کھڑی ہو گئی۔

”آئندہ میرے کمرے میں آتے وقت دروازہ ناک کر کے آنا۔“ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے ان کی آواز سنی تھی۔ بالکل خشک اور بے تاثر سی آواز وہ ان کی طرف دیکھے بغیر باہر نکل آئی۔ اس کے حساس دل پر بڑی گہری چوٹ لگی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گئی۔

”نانا بابا ایسے کیوں ہیں؟“ اس نے پہلی مرتبہ بڑی سنجیدگی سے سوچا تھا۔

پہلی مرتبہ اسے ایسا لگا تھا جیسے وہ اس سے نفرت کرتے ہیں۔ اور کسی کے دل میں اپنے لیے نفرت دریافت کرنا کوئی خوشگوار تجربہ نہیں۔ اسی لیے وہ بیڈ پر گر کر رہے آواز رونے لگی۔ کچھ دیر پہلے وہ ماما کی

تصویریں دیکھتے ہوئے بہت خوش تھی اور اب اسے سوائے رونے کے کچھ اور سوچہ ہی نہیں رہا تھا۔ نانی امی کچھ ہی دیر میں اسے ڈھونڈتی ہوئی کمرے میں آ گئیں۔ ان کی آہٹ پاتے ہی اس نے سیکے میں منہ

چھپائے اپنے آنسو صاف کر ڈالے۔ وہ ان سے اپنا رونا چھپا لینا چاہتی تھی۔

”کیا ہوا بیٹا؟“ وہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

”میں بہت بور ہو رہی ہوں نانی امی! آخر یہ چھٹیاں کب ختم ہوں گی۔“ اس نے اسی طرح لیٹے لیٹے کہا۔

”چلو کہیں باہر چلتے ہیں۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولیں۔ وہ اٹھی تو ان کی نظر اس کے روئے ہوئے چہرے پر پڑی۔ وہ رو رہی تھی اور اپنے رونے کو ان سے چھپا بھی رہی تھی۔ ان کا دل اندر ہی اندر رو دیا۔ لیکن بظاہر انہوں نے ایسے ظاہر کیا جیسے اس کے رونے کا انہیں پتا ہی نہیں چلا ہو۔

”میں سعد کے گھر چلی جاؤں نانی امی؟“ اس روز کے بعد سے اس کی سعد سے ملاقات نہیں ہوئی اور ابھی اچانک ہی اسے اس کا خیال آیا۔ وہ اجازت دینے میں کچھ متذبذب تھیں۔

”مجھے اس کا گھر معلوم ہے۔ اسلم کو ساتھ لے جاتی ہوں۔“ وہ بیڈ پر سے اتر کر اپنے کپڑوں کی تنگنیں

درست کرتے ہوئے بولی۔

”زیادہ دیر نہیں لگانا۔“ کچھ سوچتے ہوئے بالآخر انہوں نے اجازت دے دی۔ اسلم اور کینڈی کو ساتھ لیے وہ اس کے گھر پہنچ گئی۔ اتفاق سے گیٹ پر ہی اس کی زوہیب سے ملاقات ہو گئی۔

”سعد ہے؟“ سلام دعا کے فوراً بعد اس نے سعد کے بارے میں پوچھا۔

”بھائی تو اپنے دوستوں کے ساتھ کہیں گیا ہوا ہے۔“ زوہیب کے جواب سے اسے بڑی مایوسی ہوئی تھی۔ وہ واپس جانے کا سوچ رہی تھی کہ وہ جلدی سے بولا۔

”آپ اندر تو آئیں۔“

”نہیں۔ میں چلتی ہوں پھر کبھی آ جاؤں گی۔“ اس نے انکار کیا تھا مگر زوہیب دوبارہ اصرار سے اندر بلانے لگا۔

”میں اور می تو ہیں گھر پر۔ آپ ہم لوگوں سے مل لیں۔“ کچھ سوچ کر وہ زوہیب کے ساتھ اندر آ گئی۔ اس کی محی لان میں ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔

”می یہ فریاد وہ جسے بھائی باربی کہتے ہیں۔“

زوہیب نے اس کا اپنی محی سے تعارف کروایا۔

انہوں نے مسکراتے ہوئے بڑی دلچسپی سے پنک اسکرٹ بلاؤز پہنے ہوئے اس کیوٹ سی پچی کو دیکھا۔ انہوں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا تو وہ کچھ شرماتی ہوئی ان کے برابر کرسی پر بیٹھ گئی۔

”ہاں۔ سعد نے تمہارا ذکر کیا تھا۔ کہہ رہا تھا میری ایک نئی فرینڈ بنی ہے اور وہ بالکل باربی لگتی ہے۔ ہنستی اور روتی بھی بالکل گڑیا کی طرح ہے۔“ وہ سعد کی بات دہراتے ہوئے مسکرائیں۔ وہ اپنی تعریف پر شرماسی گئی۔

”اور می! یہ بھائی کی پہلی دوست ہے جو اتنی نیک شریف اور معصوم ہی ہے۔ ورنہ ان کے دوست چاہے وہ لڑکیاں ہوں یا لڑکے سارے کے سارے تیز طرار اور چالاک ہیں۔“ وہ زوہیب کے اپنے بارے میں کمٹنس بڑے غور سے سن رہی تھی۔

”تم سعد سے ملنے آئی ہو گی نا گھر گھر پر نکلتا ہی نہیں ہے یہ لڑکا! آج کل چھٹیاں ہیں تو مزید آؤارہ گردیوں کے لیے کھلی چھٹی ملی ہوئی ہے۔ اصل میں اس کے ڈیدی کی دی ہوئی شہ ہے یہ۔ ورنہ میں تو یہ

سب دوستیاں دوستیاں دو سینڈ میں ختم کرادوں۔“

وہ سعد کی دوستیوں سے خاصی نالاں نظر آ رہی تھیں۔ اسے سعد کی مٹی بھی سعد اور زوہیب کی طرح اچھی لگیں۔ انہوں نے اس سے بلاوجہ کے کوئی سوال جواب نہیں کیے۔ وہ پاکستانی نہیں لگتی، اس کی کس یورپین ہیں۔ حالانکہ اس کے نانا، نانی پاکستانی ہیں۔ اکثر لوگ اسی حوالے سے اس سے سوالات کیا کرتے تھے۔ اگر نانی امی ساتھ ہوتیں تو وہ لوگوں کے سوالوں کے جواب دیا کرتی تھیں، نہیں تو اسے خود جواب دینا پڑتا تھا اور ایک ہی بات بار بار دہرا کر وہ تنگ آ چکی تھی۔

اب تو اس کا دل چاہتا تھا کہ ایک پرچے پر بڑا بڑا جملہ لکھ کر کہ ”میرے پاپا اپنیشن تھے اور ماما پاکستانی اور میں شکل صورت میں پوری کی پوری اپنے پاپا جیسی ہوں ماما سے سوائے سیاہ گھنگھریالے بالوں کے میں نے اور کوئی چیز نہیں لی۔“ اور پھر اس کا تعویذ بنا کر اپنے گلے میں ڈال لے۔ تاکہ ہر وقت کی مشقت سے اس کی جان چھوٹ جائے۔ پتا نہیں لوگوں کو بلاوجہ دوسروں کے معاملات میں اتنی دلچسپی کیوں ہوتی ہے۔“

وہ تقریباً ایک گھنٹہ ان کے گھر رہی تھی اور اس دوران انہوں نے اس سے ایسی بات نہیں پوچھی تھی جو اسے بری لگی ہو۔ چلتے وقت انہوں نے اس کے بہت منع کرنے کے باوجود اسے بہت ساری چاکلیٹس بھی دی تھیں۔

”آؤں گی کسی دن میں تمہاری نانی امی سے ملنے۔ تم سے مل کر اندازہ ہو رہا ہے کھوہ بھی بہت اچھی ہوں گی۔“ انہوں نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

”مٹی کو یہ تو معلوم ہی نہیں ہے کہ بھائی اپنے دوست کے ساتھ اس کی گاڑی لے کر نکلا ہوا ہے۔ اسے گاڑی چلانے کا شوق چڑھا ہوا ہے۔ آج کل اور مٹی ظاہر ہے اس بات کی اجازت کیسے دے سکتی ہیں۔ اسی لیے وہ اپنے دوست کے ساتھ اس کی گاڑی میں گیا ہے۔“ اس کے ساتھ گیٹ کی طرف آتے ہوئے زوہیب نے آہستہ آواز میں بتایا۔ وہ اس کی بات سن کر حیران رہ گئی۔

”وہ ڈرائیونگ کر لیتا ہے؟“

”اور نہیں تو کیا۔ جس روز مٹی کو پتا چل گیا تو مزہ آئے گا۔ مجھے تو ڈرا کر چپ کرایا ہوا ہے۔ ورنہ میں تو کب کا شکایت کر چکا ہوتا اور ساڑھے بارہ سال کی عمر میں ڈرائیونگ کرنے پر تو اسے ڈیڑی بھی نہیں چھوڑیں گے۔“ وہ اس کی حیرت کے جواب میں بولا تھا۔

وہ کینیڈی کو گود میں اٹھائے باہر نکلی تو اسلم اس کا منتظر تھا۔ اس کے ساتھ گھر واپس آتے ہوئے بھی وہ

سعد کے گاڑی چلانے ہی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اس کا نانا ابا سے سامنا ہو گیا تھا۔ وہ اور نانی امی لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے۔ نانا ابو کو دیکھتے ہی اسے ان کا کچھ دیر پہلے کا رویہ یاد آ گیا۔ حالانکہ وہاں جا کر وہ وقتی طور پر اس بات کو بھول چکی تھی۔ انہوں نے بڑے غور سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ نانی امی نے ٹی وی اسکرین سے نظریں ہٹا کر اسے مخاطب کیا۔

”مل آئیں اپنے دوست سے؟“

وہ ایک مختصر سا ”جی“ کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ہاں رات میں جب وہ نانی امی کے ہاتھ پر سر رکھ کر سونے لیٹی تو انہیں سعد کی مومی وغیرہ کے بارے میں پوری تفصیل سے بتایا۔

ان سے باتیں کرتے ہوئے کتنی بار اس کا دل چاہا کہ پوچھے۔

”نانا ابا مجھ سے ناراض کیوں رہتے ہیں۔ میں نے تو انہیں کبھی ستایا بھی نہیں۔ کبھی کوئی ضد بھی نہیں کی۔ پھر وہ مجھ سے اتنے خفا خفا سے کیوں رہتے ہیں۔ بات بھی کرتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے بڑی مجبوری میں مجھے مخاطب کیا ہو۔“

لیکن وہ یہ بات پوچھنے کی ہمت کر نہیں پائی تھی۔ بس اسی بات کو سوچتے سوچتے سو ضرور گئی تھی۔

اگلے روز ابھی وہ ناشتے سے فارغ ہو کر بیٹھی ہی تھی کہ ملازم کی زبانی اے سعد کے آنے کی خبر ملی تھی۔

دن کے دس بج رہے تھے۔ وہ اس کے آنے کا سن کر خوشی سے بھاگتی ہوئی باہر نکلی تھی۔ وہ گیٹ کے پاس ہی کھڑا ہوا تھا۔

”تم یہاں کیوں کھڑے ہو گئے۔ اندر آؤ نا۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے جانے لگی تھی۔

”اندر وندر میں نہیں آ رہا۔ میں تو صرف اس وجہ سے آ گیا تھا کہ کل تم آئی تھیں۔ تو سوچا چلو کھڑے

کھڑے تم سے ہائے ہیلو ہی کر لوں۔“ اس کے انکار پر اس کا منہ لٹک گیا تھا۔

”تم ہر وقت گھر میں کیسے رہ لیتی ہو۔ مجھے تو سخت بوریت ہو رہی ہے آج کل۔ اسکول کھلیں تو جان چھٹے

اس بوریت سے۔“ وہ ہر اسامہ بنا کر بولا۔

”میں کبھی تم مجھ سے ملنے آئے ہو۔ اور اب میرے ساتھ بیٹھ کر بہت ساری باتیں کرو گے۔“ وہ خود کو

شکوہ کرنے سے روک نہیں پائی۔

”باتیں میں تمہارے ساتھ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ تمہارے پاس سائیکل ہے تو چلو میرے ساتھ۔“

ماتنگ کرتے ہوئے باتیں بھی کریں گے۔“ اس نے فوراً ہی حل پیش کر دیا۔

”میرے پاس تو سائیکل نہیں ہے۔ میری سائیکل تو وہاں اسپین والے گھر میں ہی رہ گئی۔“ وہ ایک دم بولنے بولتے چپ ہو گئی۔

سعد کو ذرا لگا کہ کہیں وہ رونا نہ شروع کر دے اسی لیے جلدی سے بولا۔ ”تم میری سائیکل پر بیٹھ جانا۔ اسی پتہ پر ہی۔“ وہ اس کے جلدی مچانے پر اپنی کچھ دیر پہلے والی سوچ سے باہر آ کر نانی امی کو بتانے اندر ہوا کی تھی۔

وہ وہیں کھڑا اس کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا دو منٹ میں ہی وہ واپس آ گئی۔ باہر نکلے تو اس نے اپنی سائیکل اسے پیش کر دی تھی۔ کچھ ہچکچاتے ہوئے وہ سائیکل پر بیٹھ گئی۔ سعد پیدل ہی چلنے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ کینڈی بھی چل رہی تھی۔ اتنے دن بعد سائیکلنگ کرنا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔

”ویسے سائیکلس پاکستان میں بھی ملتی ہیں۔ تم اپنے نانا ابا سے کہہ کر اپنے لیے ایک نئی سائیکل کیوں نہیں منگوا لیتیں۔“ کچھ دیر بعد اس نے فریاد کیا تھا۔

”نانا ابا سے۔“ وہ پتا نہیں کیا سوچ کر افسردہ ہو گئی۔

”کیوں وہ تمہیں منگوا کر نہیں دیں گے کیا؟“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

”وہ مجھ سے بات ہی نہیں کرتے۔“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

”کیوں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”پتا نہیں کیوں میری سمجھ میں نہیں آتا وہ مجھ سے ناراض کیوں ہیں۔ حالانکہ ماما پاپا کی ڈیوٹی کے بعد وہ ٹوڈ مجھے لینے کے لیے میڈرڈ آئے تھے تب بھی انہوں نے مجھے ویسے پیار نہیں کیا تھا جیسا مجھے کراچی پہنچنے پر نانی امی نے گلے لگا کر کیا تھا۔ مجھے گلے لگا کر وہ اتار روٹی تھیں اور نانا ابا نے تو آج تک کبھی مجھے گلے لگا کر پیار نہیں کیا۔“ وہ بہت اداسی سے یہ بات بتا گئی تھی۔

پہلی مرتبہ اس نے کسی کے ساتھ نانا ابا کے رویے کو ڈسکس کیا تھا۔ وہ دونوں پارک والی سڑک پر مزے۔

”ہو سکتا ہے تمہاری ماما نے اپنی پسند سے شادی کر لی ہو تمہارے پاپا سے۔ اور اسی بات پر وہ ان سے ناراض ہوں۔“ سعد نے کچھ دیر بعد ایک نئی بات اسے بتائی۔ وہ حیران ہو کر اس کی بات سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔

”تم اپنے ماما پاپا کے ساتھ کبھی کراچی آ کر اپنے نانا نانی سے ملی تھیں؟“ سعد نے سوال پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”میں نے نانا ابا اور نانی امی کی صرف تصویر دیکھی ہوئی تھی۔ وہ بھی ایسے تھے۔ سب ماما اپنی وارڈ روم صاف کر رہی تھیں تب انہوں نے مجھے دکھائی تھی۔ میں نے انہیں پہلی مرتبہ اس وقت دیکھا تھا جب وہ مجھے لینے میڈرڈ آئے تھے اور نانی امی کو کراچی آ کر دیکھا تھا۔“ وہ دونوں پانچ بیس داخل ہو گئے۔

”بس پھر یہی بات ہوگی۔ تمہارے پاپا پاکستانی نہیں تھے ناں اسی بات پر تمہارے نانا ابا ان سے ناراض ہو گئے ہوں گے۔“ وہ بڑی سمجھداری سے سر ہلاتے ہوئے بول رہا تھا۔ وہ اس کے منٹوں میں ساری بات سمجھ لینے پر متعجب تھی۔

”تم نے یہ بات کیسے سوچی سعد؟“

”میں تم سے دو سال بڑا ہوں۔ اور عقل بھی میرے پاس تم سے کافی زیادہ ہے۔ اور میں اس کا استعمال بھی کرتا ہوں۔“ وہ اپنی بڑائی اور عقلمندی پر اترا کر بولا۔

وہ اس کے یہ بات بتا دینے کے باوجود بھی کچھ الجھی ہوئی سی تھی۔ لیکن وہ پیسے احساسات ظاہر نہیں کر پارہی تھی۔ شاید ابھی وہ اتنی چھوٹی تھی کہ خود اپنی ہی کوئی بات دوسرے تک پہنچانے کے لیے اسے لفظ نہیں سوچ رہے تھے۔ ورنہ ذہن میں ایک سوال مسلسل گونج رہا تھا۔

”شادی تو مامانے کی تھی۔ وہ ان سے ناراض ہوں میں نے کیا کیا ہے۔“ تیسرے دن یہ بات سعد سے کہہ نہیں پارہی تھی۔ اس لیے سر جھٹک کر خود ہی موضوع بدل گئی۔

”ہاں بڑے عقلمند ہو کسی دن کوئی ایک سیڈنٹ ہو گیا تو پتا چلے گا عقل مندی ہے۔ اور آئی انکل کے ہاتھ شامت الگ آئے گی۔“ وہ اس کے گاڑی چلانے کا حوالہ دیتے ہوئے بولی۔

”زوہیب چغل خور نے بتائی ہوگی تمہیں یہ بات اسی لیے میں اسے ایڈ گولڈی بات نہیں بتاتا۔“ وہ دانت پیس کر بولا۔ سائیکل ایک طرف کھڑی کر کے وہ اس کے ساتھ واک کرتے گئے۔

”اور تم مجھے باربی کیوں کہتے ہو مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا یہ نام۔“ اسے چائے ایک اور بات یاد آئی۔ وہ اس کے ناراض سے انداز پر ہنس پڑا۔

”مجھے تو اچھا لگتا ہے۔ لہذا میں تو یہی بولوں گا تمہیں پہلی دفعہ دیکھتے ہی مجھے باربی یاد آ گئی تھی۔ تم گڑبوں سے نہیں کھیلتیں تمہیں باربی اچھی نہیں لگتی؟“ جملے کے اختتام پر اسے قے سوالیہ انداز اختیار کیا

تھا۔

”زہر لگتی ہے مجھے بارہی سوکھی سڑی مجھے تو بالکل بھی خوبصورت نہیں لگتی۔ اور مجھے گڑیوں سے کھیلنا بھی اچھا نہیں لگتا۔“ وہ اپنی ناپسندیدگی کا برملا اظہار کر رہی تھی۔

”تمہاری ممی کتنی سو میٹ سی ہیں سعد۔“ اسے اس سارے قصے سے اچانک ہی اس کی ممی بھی یاد آ گئیں۔ وہ اس کے اتنے تیز رفتاری سے ایک کے بعد ایک موضوع تبدیل کرنے پر حیران سا ہوتا اپنی ممی کے بارے میں اس کے تعریفی کلمات سننے لگا۔

اس روز وہ دونوں کافی دیر تک ساتھ رہے تھے۔ واپس آ کر فوراً تو اسے سعد کی نانا ابا کی ناراضی سے متعلق بتائی گئی بات یاد نہیں آئی تھی۔ مگر دوپہر میں جب وہ اپنے کمرے میں لیٹی تو اسے بے ساختہ ہی اس کی صبح والی بات یاد آ گئی۔

سعد نے اس کے لیے سوچ کا ایک نیا دروا کیا تھا۔ پھر اسی رات وہ نانی امی سے اپنی اس سوچ کا ذکر بھی کر گئی۔

”ماما نے پاپا کے ساتھ اپنی پسند سے شادی کی تھی اس لیے نانا ابا ان سے ناراض ہیں؟“ وہ اس کے منہ سے اتنی بڑی بات جو ابھی اس کی عمر اور سوچ سمجھ سے بہت آگے کی بات تھی سن کر سکت رہ گئیں۔

”تم سے کس نے کہی ہے یہ بات فری۔“ کافی دیر بعد انہوں نے سختی سے پوچھا۔ وہ اسے ایسی باتوں سے کتنا بچانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ رشتہ داروں میں ایسے لوگوں سے جو دوسروں کے معاملات میں انوالو ہونا اور زبان کے چٹخاروں کے لیے لوگوں کو ڈسکس کرنا پسند کرتے تھے ان سے میل جول میں بہت کمی کر دی تھی۔ کبھی ایسے کسی رشتہ دار سے ملاقات ہوتی بھی تو فریہ کو ان لوگوں کی باتوں سے دور رکھنے کی کوشش ضرور کرتی تھیں۔ وہ لوگوں کو اپنی فیملی سے متعلق باتیں کرنے سے نہیں روک سکتی تھیں، مگر فریہ کے علم میں ایسی باتوں کو آنے سے تو روک سکتی تھیں۔

وہ اسے کسی بھی ذہنی اور جذباتی الجھن کا شکار ہونے سے بچانا چاہتی تھیں۔ ابھی وہ بہت چھوٹی تھی وہ سب کچھ سمجھ نہیں پائے گی۔ بس اس کی شخصیت الجھ جائے گی۔ وہ اسے ہر طرح پر اعتماد اور خوش دیکھنا چاہتی تھیں۔ مگر ان کی ہزار ہا کوششوں کے باوجود بھی نجانے کہاں چوک ہو گئی تھی۔

وہ نانی کے غصے میں آ جانے پر کچھ ڈر سی گئی۔

”کسی نے بھی نہیں بتائی ہے مجھے یہ بات میں نے خود سوچا تھا۔ نانا ابا آپ کی طرح ماما کی باتیں جو

نہیں کرتے ہیں۔ میں نے کبھی ان کے منہ سے ماما پاپا کے بارے میں کوئی بات سنی ہی نہیں۔ بلکہ وہ تو مجھ سے بھی بہت کم بات کرتے ہیں۔“ ڈرتے ڈرتے اس نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے یہ بات کہی۔ وہ اس کی حساسیت اور سمجھداری پر شاک کی سی کیفیت میں مبتلا خاموش لہینی تھیں۔ وہ ان کے برابر میں لیٹی بڑے غور سے ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی جس پر اب دکھ، غم، رنج اور ملال کے سوا کوئی رنگ نظر نہیں آ رہا تھا۔ انہیں ایسا لگا جیسے وہ خود کو رونے سے روک رہی ہو۔

”بالکل غلط بات سوچی تم نے۔ میں نے تمہیں تصویریں نہیں دکھائی تھیں نانا ابا اور تمہاری ماما کی۔ کتنی دوستی تھی ان میں تمہارے نانا ابا تو ضوئی سے بہت پیار کرتے تھے۔ اسی لیے اس کے بارے میں کسی سے بات نہیں کرتے۔ انہیں دکھ ہوتا ہے ناں اس کے اتنی جلدی اللہ تعالیٰ کے پاس چلے جانے پر۔ وہ سوچتے ہیں کہ اگر وہ مجھ سے یا تم سے تمہاری ماما پاپا کی باتیں کریں گے تو ہم لوگ بھی ادا اس ہو جائیں گے۔ اس لیے وہ ان کے بارے میں کوئی بات نہیں کرتے۔ اور تم سے کم بات کرنے کا جہاں تک سوال ہے تو اصل میں وہ بڑے کم گو انسان ہیں ورنہ تم سے تو انہیں اتنا پیار ہے کہ میں بتا نہیں سکتی۔ آج ہی تو مجھ سے کہہ رہے تھے کہ پھر فری کا اسکول کھل جائے گا۔ چھٹیاں ختم ہونے سے پہلے اسے کہیں گھا پھرا کر لے آتے ہیں۔“

خود کو سنبھالتے ہوئے انہوں نے اسے بڑا تفصیلی جواب دیا تھا۔ ساتھ ساتھ اسے بغور دیکھتی بھی جا رہی تھیں کہ وہ ان کے جواب سے مطمئن ہو رہی ہے یا نہیں۔ وہ چھوٹی تھی اس کا کسی بھی بات سے دھیان بڑے آرام سے ہٹایا جاسکتا تھا۔ وقتی طور پر اس کا دھیان ہٹ ہی گیا تھا۔ نانی امی نے فوراً ہی پاکستان کے شمالی علاقوں کی سیر کا پروگرام بنانا شروع کر دیا تھا اور وہ خود بخود اس میں دلچسپی لینے پر مجبور ہوئی تھی۔

”تم نے پاکستان میں کراچی کے علاوہ کچھ دیکھا ہی نہیں۔ اس بہانے تم دوسرے بہت سے شہر بھی دیکھ لو گی۔ پھر وہاں اسلام آباد اور پشاور میں ہمارے بہت سے رشتہ دار بھی ہیں۔ تمہیں تمہاری ماما کے بہت سارے کزنز اور ان کے بچوں سے بھی ملوائیں گے۔“ نانی امی دل ہی دل میں اس کے سوالوں پر الجھتی اور پریشان ہوتی بظاہر مسکراتے ہوئے اسے خوش کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

پھر وہ لوگ گھومنے کے لیے واقعی گئے تھے۔ نانا ابا بھی ان کے ساتھ تھے۔ چھوٹے نانا جو نانا ابا کے سگے بھائی تھے اسلام آباد میں وہ لوگ ان کے ہاں ٹھہرے تھے۔ بہت بڑا گھر تھا ان کا۔ اور وہاں بہت

ہارے افراد رہتے تھے۔ ان کے تینوں بیٹے، بہوئیں، پوتے اور پوتیاں، وہ اتنے بہت سے انجان لوگوں کو
 لے کر گھبرا گئی تھی۔ اس لیے زیادہ وقت نانی امی کے ساتھ ہی لگی رہتی۔ وہاں اس کی ایج گروپ کے
 بچے سے بچے تھے اور وہ اسے اپنے ساتھ کھیلنے کی دعوت بھی دیتے تھے لیکن وہ انکار میں سر ہلا کر نانی امی
 کے پاس دیکھی رہتی۔

شجاع انکل جو چھوٹے نانا کے سب سے بڑے بیٹے تھے انہوں نے اسے دیکھتے ہی بے ساختہ نانی امی
 سے پوچھا۔ ”یہ صوفشاں کی بیٹی ہے نا۔“ اور ان کے سر ہلا دینے پر انہوں نے بڑے غور سے اس کی
 طرف دیکھا تھا۔ وہ ان کے اس طرح دیکھنے پر کچھ نزوس ہی ہو گئی تھی۔ ان لوگوں کے جانے کے دوسرے
 دن شجاع انکل نے ہی مری بھور بن، ابو بیہ، نتھیا گلی وغیرہ جانے کا پروگرام بنایا۔

۱۹۷۱ء اور چھوٹے نانا وہیں اسلام آباد میں ہی رکے رہے تھے۔ جب کہ بقیہ تمام افراد ان لوگوں کے
 ساتھ میر و تفریح کے لیے آئے ہوئے تھے۔

”ہنا! آپ اتنی چپ چاپ کیوں بیٹھی ہو۔ اچھی طرح کھانا بھی نہیں کھا رہیں۔“ ڈنر کے دوران وہ
 اس سے مخاطب تھے۔ ان کے لہجے میں بہت محبت اور شفقت محسوس کی تھی اس نے۔ وہ صرف رکی طور پر
 اس سے کھانے کے لیے نہیں کہہ رہے تھے بلکہ واقعی ان کی آنکھوں میں اس کے لیے محبت اور اپنائیت
 تھی۔

نانی امی کے بعد یہ دوسرے رشتہ دار تھے جو اسے پاکستان آ کر ملے تھے جن کے انداز میں اس نے گرم
 دوشی اور غلوس پایا تھا۔ نازیہ آئی بھی اس کے ساتھ بہت اچھی طرح پیش آ رہی تھیں۔ وہ بھی شجاع انکل
 کی طرح پر غلوس ہی لگی تھیں اسے۔

ان کی دوہی بچے تھے حمزہ اور فرحین، حمزہ بڑا سنجیدہ اور کسی حد تک مغرور سالنڈ کا تھا۔ ایک آدھ دفعہ کے
 بعد اس نے پھر دوبارہ کبھی اسے ساتھ کھیلنے کی دعوت نہیں دی تھی۔ جب کہ فرحین نازیہ آئی کی طرح
 اہلک ہالونی اور مخلص سی لڑکی تھی۔ اس کی دوستی تو گو وہاں پر کسی سے بھی نہیں ہوئی تھی، لیکن پھر بھی اسے
 وہاں پر شجاع انکل کی فیملی سب سے زیادہ پسند آئی تھی۔ باقی دونوں انکلز اور ان کی فیملیز کے بارے میں
 اس کی رائے کچھ خاص اچھی نہیں تھی۔

وہ لوگ اس کے ساتھ اسی اجنبیت بھرے سلوک کا مظاہرہ کر رہے تھے جیسا نانا ابا کیا کرتے۔ وہاں پر
 بھی کسی نے اس کی ماما یا پاپا کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔

وہ اس کی ماما کے چچا کا گھر تھا۔ وہ سب لوگ اس کی ماما کے کزنز تھے۔ اسی لیے اس کی ماما کے بارے میں ضروریات کرنی چاہیے تھی۔ اسے ان لوگوں کا ماما کو نظر انداز کرنا سخت ناگوار لگا۔ تھا۔ کیا ان لوگوں کو وہ اس کی ماما کے مرنے کا کوئی افسوس نہیں ہوا؟

اسکول کھانے سے ایک روز پہلے وہ لوگ واپس آ گئے۔ رخصت ہوتے وقت ہی نے ماما اور شجاع انکسٹر نے اسے گفتگو بھی دے دی تھی۔ شجاع انکل نے جس طرح اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے یہ کہا تھا۔ اسے ان کا وہ انداز بہت اچھا لگا تھا۔

واپس آ کر وہی روٹین شروع ہو گئی۔ اسکول پڑھائی، ہوم ورک، سعد سے ملنے والی ملاقات ہوتی تھی۔ اسکول میں جتنی اس کی لڑائیاں اور جھگڑے مشہور تھے ایسے ہی اس کی دوستیاں بھی بہت مشہور تھیں۔ اس کے اتنے دوست تھے کہ گنتی کرنی مشکل تھی۔ فریسا سوچتی کہ اسکول میں کبھی کوئی نیکیشن ٹائپ کی چیز ہوتی ہے۔ سعد کو اس میں ضرور حصہ لینا چاہیے۔ اس کے آگے مشکل ہی سے کوئی اور جیت پائے گا۔



لنچ بریک میں سعد اپنے دوستوں کے ساتھ شور مچاتا اور دوسرے اسٹوڈنٹس یہ جملے پاس کرتا ہوا سنا کرتا تھا۔ جب اس نے فریسا کو لنچ پر اکیلے بیٹھا ہوا دیکھا۔ وہ گم گم سی بیٹھی پتا نہیں کیا۔ سچ رہی تھی۔ پاس میں باکس رکھا ہوا تھا مگر ایسا لگ رہا تھا کہ اس نے اسے کھولا تک نہیں ہے۔ اس سے فریسا کی کوئی دوستی اسی پر تو نہیں دیکھی تھیں، لیکن پھر بھی اسے اس طرح اکیلے بیٹھا ہوا تو بہت عرصے سے اسے دیکھا تھا۔ لنچ بریک میں اس کے ساتھ ایک دلاڑکیاں تو ہوتی تھیں۔

وہ اپنے دوستوں کو چھوڑ کر اس کے پاس آ گیا تھا۔ اس نے سعد کو اپنے پیسے آتا دیکھا تو زبردستی مسکرا دی۔ وہ اس کے اس زبردستی کے مسکرانے پر چڑھا ہوا اس کے برابر میں بیٹھا۔ اور پھر کچھ کہے بغیر اس کا لنچ باکس کھول کر دیکھنے لگا۔ اس نے اس میں سے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ سب سے زیادہ چیزیں یونیفارم میں ہوتی تھیں۔

”تم لنچ کیوں نہیں کر رہی؟“ اس نے سخت انداز میں پوچھا تھا۔ ایسے جیسے اس کا کوئی بزرگ ہو۔

”یونہی بھوک نہیں لگ رہی۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”اور تم اکیلی کیوں بیٹھی ہو۔ تمہاری دوستیں کہاں ہیں۔“ اس کی باز پرس جاری تھی۔

”میری کوئی دوستیں نہیں ہیں۔“ وہ دوستوں کے لفظ پر بڑی ناراضی سے بولی۔ ”انہیں میری باتوں

سے بوری تہی رہتی ہے۔ میں بہت بور اور ڈل ہوں، وہ لوگ میرے پاس اس وقت آتی ہیں جب ان کے پاس کوئی ایجنڈا نہیں ہوتا، جب کسی کی دوست نہیں آتی تو وہ وقت گزارنے کے لیے میرے پاس آ جاتی ہے پھر اگلے روز جب اس کی دوست واپس آ جاتی ہے تو وہ میری طرف مڑ کر دیکھتی بھی نہیں۔ تم بھی تو میرے پاس اسی وقت آتے ہو، جب تمہارا اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلنے کا موڈ نہیں ہوتا یا یونہی تم فارغ ہوتے ہو۔" وہ یہ کہنے لگی کہ یہ بات پر اتنی دل برداشتہ تھی جو اسے بھی بلاوجہ درمیان میں گھسیٹ رہی تھی۔

ایک دن کے لیے تو اسے شدید غصہ آیا۔ وہ اس کے خلوص پر شک کر رہی تھی۔ ابھی وہ اپنے کتنے سارے دوستوں اور انجوائے متت کو چھوڑ کر اس کے پاس آیا تھا اور وہ؟ لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے اپنا غصہ ختم کر لیا۔

"دوسروں کی اچھائی برائی کا فیصلہ کرنے سے پہلے اس بات کا فیصلہ کر لو کہ تم خود دوسروں کے ساتھ کتنی اچھی یا کتنی بری ہو۔ تمہیں اچھے دوست تب ہی ملیں گے، جب تم خود کسی کی اچھی دوست بنو گی۔ کوئی تم سے دوستی نہیں کرے گا، تو تم خود کو ان سب سے دوستی کرنے کی کوشش کرتی ہو۔" وہ دادا جان بنا بڑے غصے سے اسے نصیحتیں کرتے لگا۔

"تمہیں اصل میں کسی اور بات پر غصہ آ رہا ہے یا پھر شاید تم کسی بات پر بہت اداس ہو۔ اس لیے ہر بات کو نتیجہ انداز میں سوچ رہی ہو۔" اس نے جیسے اس کی ساری کیفیت کا تجزیہ پیش کر دیا۔ وہ خاموشی سے اس کی بات سن رہی تھی۔ سچ مانگتے ہوئے والا تھا وہ گھڑی دیکھتے ہوئے اس کے پاس سے اٹھ گیا۔

"میرا نام میں تمہارے گھر آؤں گا پھر تم سے ساری بات پوچھوں گا۔" وہ واپس اپنے دوستوں کے پاس چلا گیا۔

سعد کے نام میں آنے کا وعدہ کرنے کے باوجود اسے یقین تھا کہ وہ نہیں آئے گا۔ شام کا وقت تو اس کا اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلنے کا ہوتا تھا۔ وہ اس کی خاطر اپنے کھیلنے کے وقت کی قربانی کیوں دیتا؟ ٹھیک ہے، وہ اسے ایک دوست کہتا ہے، اس کے ساتھ بہت اچھی طرح ملتا اور باتیں کرتا ہے، لیکن وہ اس کی ایک دوست تو نہیں۔ وہ اس کے بہت سے دوسروں کی طرح ایک عام سی دوست ہے۔

یہ سب سوچتے ہی اسے باوجود اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اگر وہ نہیں آیا تو اسے بہت مایوسی ہوگی۔ وہ بالکل میں بیٹھی بیٹھا، ہنرمند کرک کرتے ہوئے درحقیقت اسی کا انتظار کر رہی تھی۔

وہ غصہ و ہرجا نہیں کیا۔ مگر اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور اپنی خوشی اس نے اس سے چھپائی بھی نہیں۔

”مجھے اتنی خوشی ہو رہی ہے۔ میں سمجھ رہی تھی تم شاید نہیں آؤ گے۔“ وہ اپنی دو پیہر کی نصیحتوں کو خالصتاً جاتا دیکھ کر اچھا خاصا چڑ گیا۔ لیکن اسے مزید کچھ سمجھانا بے کار لگا سو خاموشی سے اس کے پاس بیٹھ گیا۔

”تمہاری ڈرائنگ تو بہت اچھی ہے۔“ وہ اس کے جرنل پر بنی مینڈک کی ڈرائنگ رام کو دیکھتے ہوئے۔

۔ تاکشی انداز میں بولا۔

”ماما بھی یہی بات کہتی تھیں۔ پاپا سے کہتی تھیں کہ فری کو فائن آرٹس پڑھنے کے لیے پیرس بھیجیں گے۔“ وہ جواب میں بڑے جوش سے بولی۔ لیکن پھر ایک دم ہی چپ بھی ہو گئی۔

”تمہاری ماما کیا مصورہ تھیں؟“ وہ یوں بولا جیسے اس کے چہرے کی افسردگی دیکھی ہی نہ ہو۔

”نہیں۔ انہوں نے تو جرنلزم پڑھا تھا اور ویسے تو پاپا بھی کیمیکل انجینئر تھے۔ لیکن انہیں پینٹنگ بنانے کا بہت شوق تھا۔ وہ اکثر فارغ وقت میں پینٹنگ کیا کرتے تھے۔ واٹر کالر استعمال کرتے تھے وہ۔ اور اتنی اچھی پینٹنگز بناتے تھے کہ میں تمہیں کیا بتاؤں۔ ماما کہتی تھیں کہ پاپا کو انجینئرنگ کے بجائے فائن آرٹس پڑھنا چاہیے تھا۔ ہمارے گھر میں پاپا کے ہاتھ کی بنی ہوئی اتنی ساری پینٹنگز لگی ہوئی تھیں۔ سب ان کی تعریفیں کرتے تھے۔ میری اچھی ڈرائنگ دیکھ کر ماما کہتی تھیں کہ مجھے یہ شوق پاپا سے ملا ہے۔“ وہ اس کے پوچھنے پر دوبارہ پر جوش انداز سے بولی۔

پھر کچھ دیر تک وہ اس کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ باتیں کرتے کرتے اسے اچانک آج سکول میں ہونے والی بات یاد آئی تو بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔

”آج کیا ہوا تھا فریا! سچ بتانا۔ مجھ سے جھوٹ مت بولنا۔“

”آج میرے پاپا کی برتھ ڈے ہے۔“ وہ سر جھکائے آہستگی سے بولی۔ شاید اپنے آنسو چھپا چھپا رہی تھی۔

”ہر سال ہم لوگ پاپا کی ماما کی اور خود میری برتھ ڈے بہت اہتمام سے مناتے تھے۔ انوائٹ کسی کو نہیں کرتے تھے۔ بس ہم تینوں ہوتے تھے اور خدیجہ آنٹی، خدیجہ آنٹی، ہماری میڈیٹس، مصری تھیں وہ۔ ماما پاپا انہیں نوکر نہیں سمجھتے تھے وہ بالکل گھر کے فرد کی طرح رہتی تھیں ہمارے ساتھ، مجھے قرآن بھی انہوں نے ہی پڑھایا تھا۔ پاپا کی سالگرہ ہوتی تو میں، ماما اور خدیجہ آنٹی ان سے چھپا کر سالگرہ کا سارا اڑ بھجوت کرتے اگر ماما کی ہوتی تو ان سے میں، پاپا اور خدیجہ آنٹی اسی طرح سب کچھ چھپاتے اور میری سالگرہ میں تو سب سے زیادہ اہتمام ہوتا تھا۔ اس روز ہم لوگ لازمی کہیں گھومنے جایا کرتے تھے۔ پاپا مجھے میری پسند

کی خوب سا رہی شاپنگ بھی کروا تے تھے۔“

وہ اسی طرح سر جھکا کر روتے ہوئے بول رہی تھی۔ ”خدیجہ آئی سب۔ سعد! ماما! پاپا مجھے چھوڑ کر کیوں چلے گئے۔ مجھے ان کے بغیر کچھ اچھا نہیں لگتا۔“

وہ کچھ رہتی تھی کہ شاید پہلے کی طرح آج بھی وہ اس کے رونے پر ناراض ہوگا۔ ڈانٹنے کا بلکہ شاید مذاق بھی اڑائے گا لیکن اس کی توقع کے برخلاف وہ خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ چہرہ بھی بہت سنجیدہ سا تھا۔

”اس روز وہ لوگ شاپنگ کرنے جا رہے تھے۔ مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا تھا پاپا نے۔ لیکن مجھے اسکول کا بہت سارا کام تھا۔ اس لیے میں نے جانے سے منع کر دیا تھا۔ خدیجہ آئی اور میں گھر پر ہی رک گئے

تھے۔ اردو دو تونوں چلے گئے تھے۔ جب ہاسپٹل سے فون آیا تو خدیجہ آئی مجھے یہ بتائے بغیر کہ کہاں جا رہی ہیں ہاسپٹل چلی گئی تھیں۔ ماما اس وقت زندہ تھیں۔ ان کا انتقال خدیجہ آئی کے پہنچنے کے بعد ہوا

تھا۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسا ہو جائے گا۔ آخری بار میں نے انہیں جس طرح دیکھا وہ میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ وہ دونوں سو رہے تھے گہری نیند میں اور میں انہیں چیخ چیخ کر آوازیں دے رہی تھی

مگر وہ میری آوازیں ہی نہیں رہے تھے۔ پھر میں کتنے دن تک ہاسپٹل میں ایڈمٹ رہی تھی۔ سب میرے پاس تھے۔ خدیجہ آئی ہمارے بہت سے فیملی فرینڈز پاپا کے کولیگز ماما کی دوستیں پڑوسی مگر مجھے

ان میں سے کوئی بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اپنا نہیں لگ رہا تھا۔“ روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ

گئیں۔

سعد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کس طرح چپ کرائے۔

اسی لیے خاموش بیٹھا دکھ بھری نگاہوں سے اسے نکلے جا رہا تھا۔ وہ اسے کس طرح تسلی دے وہ سمجھ نہیں

پا رہا تھا۔ ہاں اس کا یہ دل ضرور چاہ رہا تھا کہ اس کے آنسو صاف کر کے اس سے کوئی ایسی بات کہے کہ وہ

رودنا بھول کر منسا شروع کر دے۔

”مجھے میرا گھر بہت یاد آتا ہے سعد! وہاں کا اسکول میرے دوست میں سب کو بہت مس کرتی ہوں،

ہاں سب میرے اپنے تھے۔ یہاں تو ہر کوئی دیکھتے ہی سب سے پہلے یہ پوچھتا ہے کہ آپ کہاں کی رہتے رہی ہیں۔ میں یہاں کی نہیں ہوں، نا میں تم لوگوں سے الگ ہوں۔ مجھے تمہاری زبان بولنی بھی نہیں

آتی۔“ فوراً روتے روتے خود ہی چپ ہو گئی تھی۔

سعد نے اس کے چپ ہو جانے پر سکون سا محسوس کیا۔ ”کون کہتا ہے تم الگ ہو۔ تم اصل میں خود اپنے

آپ کو الگ تھلگ رکھتی ہو۔ اس لیے ایسا محسوس کرتی ہو۔ ایک بار تم اس ملک کو اپنے اس گھر کو اور یہاں کی تمام چیزوں کو اپنا سمجھنا شروع کر دو تو تمہیں ایسا کبھی نہیں لگے گا۔ اور جب تم اس کو سمجھ لیتی ہو تو بولنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔ ذرا سی کوشش کرو تمہیں اردو بولنا آ جائے گی۔“ وہ اسے سمجھانے لگا تھا۔

”میں اردو بول سکتی ہوں سعد۔ زیادہ نہیں لیکن تھوڑی بہت بول سکتی ہوں۔ لیکن میرا تلفظ صحیح نہیں ہے۔ میں بولوں گی تو سب لوگ ہنسیں گے۔“ وہ شرمندگی سے اپنی کمزوری کا اعتراف کر رہی تھی۔

”تم اپنے نانا، نانی اور میرے ساتھ بولا کرو۔ ہم لوگ بالکل نہیں ہنسیں گے۔ تھوڑے ہی دنوں میں تمہارا تلفظ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔ ویسے تمہیں اردو سکھانی کس نے تھی۔ تمہاری ماں نے؟“ اسے تسلی دیتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”ہاں۔“ وہ مسکرائی اور پھر کچھ جھکتے ہوئے وہ اردو میں آگے کی بات بولی۔ ”یہاں ماما کی بہت ساری پاکستانی فیملیز سے بھی دوستی تھی اور ان لوگوں کے ساتھ ماما اردو ہی میں بات کرتی تھیں۔ ماما سے سن سن کر پایا کو بھی تھوڑی بہت اردو آگئی تھی۔ ہمارے گھر میں اسپینش، انگریزی اور اردو تینوں زبانیں بولی جاتی تھیں ماما کو اسپینش بہت اچھی آتی تھی۔“ وہ اس کے اردو بولنے پر خوش ہوا۔

”بالکل صحیح تو بول رہی ہو تم۔“ اسے اندازہ تھا کہ وہ اس کا دل رکھنے کے لیے تعریف کر رہا ہے، لیکن وہ پھر بھی خوش ہوئی تھی۔ نانی امی کو لان میں آتا دیکھ کر وہ دونوں ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”کیسے ہو سعد؟“ اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے پر شفقت انداز میں پوچھا۔

”میں ٹھیک ہوں نانی امی!“ فریاد کی طرح اس نے بھی انہیں نانی امی کہنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ان لوگوں کے پاس ہی گھاس پر بیٹھ گئیں۔ وہ اپنا جزل اور کتابیں رکھنے کے بہانے جلدی سے اٹھ کر اندر آ گئی۔ اندر آتے ہی اس نے واش روم میں گھس کر خوب رگڑ رگڑ کر منہ دھویا۔ نانی امی اسے روتا دیکھ کر پریشان ہو جاتی تھیں اور وہ انہیں اپنی وجہ سے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ وہاں سے لوگوں کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔ صبح سے جو اداسی اور دل گرفتگی نے اسے اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ وہ یکدم ہی دور ہو گئی تھی۔

اسے محسوس ہوا کہ وہ لڑکا جسے شروع میں وہ بہت تیز چالاک اور بد تمیز سمجھتی تھی، بول کا بہت اچھا بنے اور بڑے غیر محسوس انداز میں وہ اس کا خیال رکھتا ہے۔ اس طرح کہ کبھی اس بات کو جانتا بھی نہیں ہے۔



اس کے فائل ایگزیمز میں اچھے نمبر نہیں آئے تھے۔ اپنے بہت برے گریڈز لانے پر جب اس نے مانی امی کے چہرے پر تفکر اور اداسی دیکھی تو اسے بہت پشیمانی ہوئی۔ انہوں نے اس سے کچھ بھی نہیں کہا مگر ایسا لگ رہا تھا کہ انہیں اس سے اتنے برے رزلٹ کی توقع نہیں تھی۔ نانا ابا نے تو حسب عادت کچھ ہی کہے بغیر پروگریس رپورٹ پر ایک نظر ڈالی تھی اور پھر اخبار پڑھنے لگے تھے۔ لیکن مانی امی کا رد عمل درحقیقت اسے سخت نادام کر گیا۔

اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ پہلے کی طرح ویسی ہی ذہین اور پڑھا کو سی فریابن جائے۔ لیکن پتا نہیں کیا ہو گیا تھا اسے۔ کتابوں کے نام سے وحشت ہوتی تھی اسے۔ امتحان سے پہلے جب بھی وہ پڑھنے کے لیے بیٹھتی تو بڑی کوشش کے باوجود بھی کچھ یاد نہیں کر پاتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ لفظوں کو خالی نگاہوں سے دیکھے جا رہی ہے۔



شام میں وہ سعد کے گھر گئی تو۔ سعد اور زویب لان میں بیٹھ کر کھیل رہے تھے۔ وہ دونوں اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

”آؤ فری! تم بھی ہمارے ساتھ کھیلو۔“ سعد نے اسے کھیلنے کی آفر کی مگر وہ انکار میں سر ہلاتی لان چیئر پر بیٹھ گئی۔ سعد نے ایک نظر اس پر ڈال کر دوبارہ کھیل شروع کر دیا۔

”کیا ہو گیا ہے بھائی! تم توجہ سے نہیں کھیل رہے۔“ کچھ ہی دیر گزری ہوئی جب اس نے زویب کی جانب بھٹلائی ہوئی آواز سنی۔

”ہاں شاید میں تھک گیا ہوں۔“ اس نے جیسے اپنی کوتاہی تسلیم کی تھی اور پھر ریکٹ ایک طرف ڈال کر فریا کے پاس آ گیا۔ زویب منہ بگاڑتا ہوا اندر چلا گیا۔

”لگتا ہے خراب رزلٹ لانے پر مانی امی سے خوب ڈانٹ پڑی ہے۔“ سعد نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

فریا سے اس کا رزلٹ تو وہ اسکول میں ہی معلوم کر چکا تھا۔

”انہوں نے مجھے کچھ بھی نہیں کہا۔“ وہ جڑے پن سے بولی۔

”پھر منہ کیوں اتنا پھولا ہوا ہے۔“

”مجھے بہت شرمندگی ہو رہی ہے سعد! میرے اتنے خراب مارکس آج تک کبھی نہیں آئے۔ پتا نہیں

مجھے کیا ہو گیا ہے میرا پڑھنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔“ وہ یہاں آئی ہی اسی لیے تھی۔ سعد کے علاوہ اس کا کوئی دوست نہیں تھا اور وہ اسی سے اپنا پرانہ بلوم ڈسکس کرنا چاہتی تھی۔

”زلزلہ تو خراب آ گیا اب اس پر افسوس کر کے کیا ہو سکتا ہے۔ ہاں یہ سچ ہے۔ اب کس طرح پڑھاؤ کرنی ہے تاکہ آئندہ اس قسم کے افسوس کی نوبت ہی نہ آئے۔“ وہ سنجیدگی سے لے۔

”تم مشورہ دو میں کیا کروں۔“ وہ بڑی امید سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”سب سے پہلے تو تم یہ سمجھنا چھوڑ دو کہ تم یہاں کچھ دنوں کے لیے آئی ہو۔ آج سے دو دنوں بعد تمہیں واپس اسپین چلے جانا ہے۔“ کچھ دیر خاموشی سے سوچتے رہنے کے بعد اس نے جیتے آہیں تیز نکالا۔

وہ حیران ہو کر اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔ اس کے دل کے بہت اندر چھپی یہ بات وہ کیسے جان گیا تھا وہ اس کی حیرانی کو سنجیدگی سے دیکھتے ہوئے مزید گویا ہوا۔

”میں نے تمہارا یہی اسٹائل نوٹ کیا ہے۔ اسکول میں بھی تم ایسے ہی رہتی ہو۔“ رگھر میں بھی۔ تم ایک بار یہ بات مان کیوں نہیں لیتیں کہ تمہارے ماما پاپا مر چکے ہیں اب وہ واپس آئیں گے۔ تمہیں ہمیشہ یہیں رہنا ہے۔ تمہارے دادا دادی ہوتے یا تمہارے پاپا کے کو۔ تمہیں بھائی ہوتے تب تو واپس جانے کا سوچ بھی سکتی تھیں لیکن اب تم واپس کس کے پاس جاؤ گی۔ وہاں پر تمہارا کوئی نہیں ہے۔ اب ساری زندگی تمہیں یہیں رہنا ہے۔ نانا ابا اور نانی امی کے پاس۔ اب یہیں تمہارا گھر ہے اور یہیں تمہارا اسکول ہے۔ یہیں تمہیں فرینڈز بنانے ہیں اور یہیں تمہیں پڑھنا ہے۔“ وہ پتا نہیں اتنی بڑی بڑی باتیں کس طرح کر لیا کرتا تھا۔

اس کا سنا کی کسی حد تک صاف گولہجہ اسے ناگوار تو گزرا تھا مگر دل ہی دل میں = وہ مان رہی تھی کہ سعد جو کچھ کہہ رہا ہے وہ بالکل سچ ہے۔

پھر سعد نے بی اس کے سامنے تجویز رکھی تھی کہ وہ روزانہ ہوم ورک کرنے اور گھر آ جایا کرے۔ اور اس کی یہ تجویز فریڈ نے فوراً ہی مان بھی لی تھی۔ وہ آئندہ کبھی بھی اس قسم کی سٹرمنڈگی سے نہیں گزرنا چاہتی تھی۔

”چلو تمہیں اسکیٹنگ کی پریکٹس کراؤں۔“ اس کا مشورہ فریڈ کو پسند آ گیا۔ اور وہ مطمئن بھی ہو گئی تھی۔ اس بات پر خوش ہوتے ہوئے اس نے اسکیٹنگ کی سنجیدگی اور اس کے بہرے پر چھائی ہوئی افسردگی دور کرنے کے لیے اسکیٹنگ کا ذکر نکالا تھا۔

ابھی چند دن پہلے ہی فریا کی سالگرہ گزری تھی۔ اور اس میں نانی امی کے ساتھ ساتھ سعد نے بھی اسے گفٹ دیا تھا۔ نانی امی نے تو اسے اس کی پسند کی ڈھیر ساری شاپنگ کروائی تھی جب کہ سعد نے اسے گفٹ میں اسکیٹس دیے تھے۔ وہ اس کے اپنی سالگرہ کا دن یاد رکھنے اور گفٹ دینے پر بہت خوش ہوئی تھی۔

گزشتہ تین چار روز سے وہ سعد سے اسکیٹنگ کرنا سیکھ رہی تھی۔ ابھی وہ پرفیکٹ تو نہیں ہوئی تھی بار بار کر پڑتی تھی، لیکن اس کا خوف دور ہو گیا تھا۔

”اتنا خراب رزلٹ آیا ہے میرا اور تم مجھے کھیل کود کی دعوت دے رہے ہو۔“ وہ سعد کی بات پر برامان کر بولی۔

”میں تو تمہارا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ بلاوجہ منہ لٹا کر بیٹھی ہوئی ہو۔ خیر اگر تمہارا دل نہیں پاہرے بات کو کوئی بات نہیں۔“ وہ کندھے اچکا کر لاپرواہی سے بولا۔

کچھ دیر وہ دونوں یونہی باتیں کرتے رہے تھے اور پھر وہ دل میں اطمینان لیے واپس گھر آ گئی تھی۔



نئی کلاس میں آ کر اس نے سعد کے ساتھ پڑھنا شروع کر دیا تھا اب وہ اسکول سے آ کر جلدی جلدی نہاتی، کپڑے بدلتی، کھانا کھاتی اور پھر بیگ اٹھا کر سعد کے گھر بھاگتی نانی امی کو اس کا بغیر ستائے اور آرام کیے آتے ہی بھاگ دوڑ مچانا سخت ناگوار گزرتا تھا۔ لیکن اس سلسلے میں اس نے ان کی ناگواری کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔

سعد کی پڑھائی کے اس دور کا آغاز ہو گیا تھا جہاں سے کیریئر بنانا یا بگڑنا شروع ہوتا ہے۔ اسی لیے اس کے ممی ڈیڈی اس کی اسٹڈیز کے حوالے سے بہت کوشش تھے۔ زور سبب کا اپنا شیڈول تھا کبھی ہوم ورک زیادہ ملا ہوتا یا کوئی بہت ہی اہم ٹیسٹ ہونا ہوتا تو وہ بھی اسٹڈی میں آ جایا کرتا ورنہ وہ وقت اس کے سونے کا ہوتا تھا۔ وہ دونوں ساتھ بیٹھ کر کام کرتے ساتھ ساتھ باتیں بھی ہوتی رہتیں۔ کوئی چیز اسے سمجھ میں نہیں آتی تو سعد سے ہی پوچھ لیا کرتی۔

آہستہ آہستہ اس میں تبدیلی آرہی تھی۔ وہ خود محسوس کر رہی تھی کہ اب اسے اسکول کا کام کرنا بوجھ نہیں لگتا۔ بلکہ وہ اس کام کو انجوائے کرنے لگی ہے۔ اسکول میں اسے اتنا مزہ نہیں آتا تھا جتنا سعد کے ساتھ کام کرنے میں آتا تھا۔ اب تو کبھی کبھار وہ خود بھی پڑھتے وقت بعض چیزوں میں سعد کی مدد کر دیا کرتی

تھی۔

مضمون لکھنے میں وہ شروع ہی سے بہت اچھی تھی۔ سعد کو کسی ٹاپک پر مضمون لکھنے کو ملا ہوتا تو وہ خوب سوچ سوچ کر اسے اس میں لکھنے کے لیے کئی باتیں بتا دیا کرتی تھی۔ وہ اس کی جزل نالج پر شروع شروع میں خاصا حیران ہوا تھا۔

”تم تو چھپی رستم ہو بلا وجہ خود کو انڈرا سٹیٹ کرتی ہو۔“ وہ تعریف کرنے میں کبھی کبھو نہیں کرتا تھا۔ اس کا روزانہ پابندی سے وہاں آنا اسے سعد کے گھر میں گھر کے فرد کی سی حیثیت دلوا گیا تھا۔ اب صرف سعد ہی نہیں بلکہ اس کی مگی ڈیڈی اور زویب بھی اس کی اپنے گھر آمد کے عادی ہو چکے تھے۔ ان دونوں کی دوستی نے دونوں گھرانوں کے درمیان بھی خاصے دوستانہ روابط پیدا کر دیئے تھے۔ نانی امی اور سعد کی مگی اکثر ایک دوسرے کے گھر آ جایا کرتی تھیں۔

نانا ابا کا البتہ وہی انداز تھا۔ وہ اپنی ذات میں لگن آج بھی اس سے اتنے ہی دور تھے جتنے اول روز نظر آئے تھے۔ یہاں رہتے ہوئے اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی وہ خود کو ان کے اجنبی انداز کا عادی نہیں بنا پائی تھی۔ ان کا اجنبیت لیا ہوا سر و سپاٹ لہجہ آج بھی اس کا دل دکھایا کرتا تھا۔ اول تو وہ اسے مخاطب ہی بہت کم کرتے تھے۔ بعض دفعہ تو دن بھر میں اس کی سوائے ”السلام علیکم“ اور ”علیکم السلام“ کے ان سے کوئی بات ہی نہیں ہوتی تھی۔

شروع کی طرح اسے اب بھی ان سے بہت ڈر لگتا تھا۔ حالانکہ انہوں نے اسے کبھی ڈانٹا نہیں تھا لیکن وہ ان کو دیکھتے ہی ادھر ادھر کھکنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ ان کے سامنے نانی امی تک سے جن سے اب اس کی بہت بے تکلفی تھی، سنبھل سنبھل کر بہت محتاط ہو کر بات کیا کرتی تھی۔

وقت یوں بزرگ ہوتا گیا اسے پر لگ گئے ہوں اور نوس کا امتحان دے کر دسویں کلاس میں آ گئی تھی۔ وہ اسکول سے واپس آئی تو لاؤنچ میں نانی امی کے ساتھ ایک انجان سی شخصیت بیٹھی نظر آئی۔ ابھی نانی امی نے ان دونوں کا آپس میں تعارف بھی نہیں کروایا تھا کہ وہ خاتون بڑے والہانہ انداز میں اٹھ کر اس کے پاس آ گئیں۔ اگالو اس کے لیے بڑا حیرت انگیز تھا۔

’بغیر کچھ کہے انہوں نے اسے اس طرح گلے لگا یا جیسے پتا نہیں کتنی پرانی شناسائی ہے۔ وہ حیران پریشان اور محبت اور چاہت کا یہ مظاہرہ دیکھ رہی تھی۔ ان کے گلے گلے اسے محسوس ہوا جیسے وہ رو بھی رہی ہیں۔ نانی امی بھی اٹھ کر ان دونوں کے پاس آ گئی تھیں۔ انہوں نے تسلی دینے والے انداز میں ان

ماتون کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ انہیں خود بھی شاید اپنی بے خودی اور جذباتی پن کا احساس ہو گیا تھا اس لیے بڑی آہستگی سے خود سے الگ کر لیا۔

”ہاؤ بیٹا! تم فریش ہو کر آ جاؤ۔ پھر کھانا کھائیں گے۔“ نانی امی کی آواز میں آنسوؤں کی نمی شامل تھی۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ اسے دانستہ یہاں سے بٹا رہی ہوں۔ شاید وہ اس کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھیں۔ وہ حیران پریشان اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔

وہ خاتون کون ہیں اور اسے لپٹا لینا کس کس خوشی میں رو رہی ہیں وہ سمجھ نہیں پاری تھی کچھ دیر بعد جب وہ پوچھا کہ بدل کر نہاؤ تو کڑا منگ روم میں آئی تو وہ دونوں ڈائننگ ٹیبل پر اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

”بہت سال بعد دیکھا ہے تمہیں۔ میرے ذہن میں تو وہی چھوٹی سی فری تھی۔“ کچھ دیر پہلے کی جذباتی کیفیت کے برعکس اس وقت وہ دونوں نارمل اور خوش باش بیٹھی تھیں۔ نانی امی بھی مسکراتی ہوئی نارمل سے انداز میں بیٹھی تھیں۔ شاید وہ دونوں اس کی وجہ سے خود کو نارمل پوز کر رہی تھیں۔

”ابھی تمہارے اسکول سے آنے سے پہلے آنٹی سے میری بات ہوئی تو پتا چلا فری اب وہ چھوٹی سی بنی نہیں رہی۔ بلکہ دسویں کلاس میں آ چکی ہے۔ تو میں سن کر حیران رہ گئی وقت کتنا تیز گزرتا ہے آنٹی نکل کی بات لگتی ہے جب میں نے اور صوفی نے اسکول کو خیر باد کہہ کر ایک ساتھ کالج میں ایڈمیشن لیا تھا اور آج دیکھیں ہمارے بچے اپنا اسکول کا دور ختم کرنے والے ہیں۔“ مسکراتے ہوئے انہوں نے پہلے اسے اور پھر نانی امی کو مخاطب کیا تھا۔

ان کے منہ سے اپنی ماما کا نام سن کر وہ چونک گئی۔ وہ خود بھی شاید اس کا چونکنا سمجھ گئی تھیں اسی لیے وضاحتی انداز میں بولیں۔

”میں تمہاری ماما کی بچپن کی دوست ہوں، بہت گہری دوستی تھی ہماری۔“ وہ نانی امی کے ہاتھ کی بنی ہوئی اپنی پسندیدہ بریانی کو چھوڑ کر اب پوری طرح ان کی طرف متوجہ تھی۔ یہ گھر جہاں اس کی ماما کا نام لیا جاتا گناہ سمجھا جاتا تھا وہاں ان کی کسی دوست کا آ جانا اس کے لیے حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی کا باعث بھی تھا۔

”بہت زندہ دل اور نرس کھ تھی وہ شرارتی اتنی کہ میں تمہیں کیا بتاؤں۔ اس کے ساتھ رہ کر میں بھی اس کی طرح ہو گئی تھی حالانکہ میری نیچر نہیں تھی اتنی ہنگامہ پرور لیکن اس کے ساتھ مل کر کیا کیا شرارتیں نہیں کیں میں نے دادا گیری چلتی تھی ہماری اسکول میں پھر کالج جا کر بھی یہی حال تھا۔ ہم دونوں پڑھائی

میں اتنے اچھے تھے کہ اکثر نیچر زاس وجہ سے ہمارے ساتھ رعایت برت جاتے تھے ورنہ ہماری شرارتوں اور ہنگامہ آرائی سے پناہ وہ بھی مانگا کرتے تھے۔ ”وہ جیسے بولتے بولتے اسی دور میں کھو گئی تھیں۔“

”تم کھانا تو صحیح سے کھاؤ اور جمنڈ! یہ بگھارے بیٹنگن میں نے خاص طور پر تمہارے لیے بنائے ہیں۔“

نانی امی نے انہیں کھانے سے ہاتھ روک کر باتیں کرتے دیکھ کر ٹوکا۔

فریڈیا کو ان کا ٹوکنا بہت برا لگا۔ وہ اسے ماما کی باتیں بتا رہی تھیں اور نانی امی نے بلاوجہ موضوع تبدیل کروا دیا اور جمنڈ آئی بھی دوبارہ سے کھانے کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”آپ کے ہاتھوں کا یہی ذائقہ تو یاد آتا ہے آئی۔“ انہوں نے ڈونگا اپنی طرف کرتے ہوئے کہا تھا۔

”اور وہ بادام کا شربت آپ ابھی بھی بناتی ہیں یا نہیں۔ مجھے تو اس کا مزہ آج تک یاد ہے۔“

”اب کس کے لیے بناؤں، وہ فرمائش کر کر کے شربت بنوانے والی ہی نہیں رہتی۔“ وہ بڑی یاسیت سے بولیں۔

ار جمنڈ آئی کی خوش مزاجی بھی لمحہ بھر میں رخصت ہو گئی، وہ ضوفشائ فاروق کی دوست تھیں بچپن کی دوست، ان کا اس گھر میں آنا جانا بھی یقیناً ان ہی کی وجہ سے تھا اور آج جب وہ پتہ نہیں کتنے سالوں بعد یہاں آئی تھیں تو یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اس ہستی کا ذکر نہ ہو جو ان کے اس گھر میں آنے اور یہاں کے مکینوں سے واقفیت کا باعث تھی۔ باقی وقت سب چپ رہے تھے۔ کھانا کھا کر وہ لوگ واپس لاؤنج میں آگئے تھے۔ ار جمنڈ آئی نے اسے اپنے پاس ہی بٹھالیا تھا۔ انہوں نے تین چار شاپنگ بیگز اس کی طرف بڑھائے۔

”یہ تمہارے لیے ہے۔“ اس نے تکلفاً منع کرنا چاہا۔

”لے لو فری!“ نانی امی کے کہنے پر اس نے کچھ ہچکچاتے ہوئے وہ چیزیں لیں۔

”آپ کہاں رہتی ہیں ار جمنڈ آئی؟“ ان کی باتوں سے اتنا اندازہ تو وہ لگا ہی چکی تھی کہ وہ پاکستان سے باہر کہیں رہتی تھیں۔

”میں لندن میں رہتی ہوں۔ اور اب کی بار جب تمہاری چھٹیاں ہوں تو تم نانا یا اور نانی امی کے ساتھ میرے پاس لندن آنا علی اور مہوش سے مل کر تمہیں بہت مزہ آئے گا۔ مہوش تو تم سے بڑی ہے۔ لیکن علی تمہارے جتنا ہے۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”بچوں کو ساتھ کیوں نہیں لائیں ار جمنڈ!“ نانی امی نے اس سے پوچھا۔

”بچوں کی پڑھائی کا مسئلہ تھا۔ ہم دونوں میاں بیوی کو تو لازمی آنا تھا خاندان کی اتنی قریبی شادی نہ آتے تو سب ناراض ہو جاتے۔ آجی بار انشاء اللہ اس طرح پروگرام بناؤں گی آنے کا جب بچوں کی پڑھائیاں ہوں گی۔“ وہ اس کے ہاتھ سمیت سے اپنے ہاتھ میں لیے بیٹھی تھیں۔

وہ اس سے پہلے ان سے کبھی نہیں ملتی تھی۔ کبھی ان کا نام تک نہیں سنا تھا لیکن پھر بھی اسے وہ بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ ذرا غور کرنے پر اسے دھیان آیا کہ پرانی الہمز میں اس نے ارجمند آئی کی تصویریں بھی دیکھی ہیں۔ اس وقت وہ بہت تھک ایدہ پٹی پٹی سی تھیں۔ اب سے بالکل مختلف۔ آنکھوں پر گلاسز بھی نہیں تھا اور چہرہ بھی بہت کھلا تھا۔

”چائے بناؤں؟“ نانی ان سے پوچھنے پر انہوں نے بلا تکلف ”ہاں“ کہا۔

نانی انی بجائے کسی ملازم کو آہٹا دینے کے خود اٹھ کر کچن میں چلی گئیں۔ ارجمند آئی یقیناً نانی امی کے لیے بھی بہت خاص مہمان تھیں۔ یہ بڑے غور سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے اسے اتنی خوبیت سے اپنی طرف دیکھتا پایا تو مسکرائیں۔

”تم تو ضوفی کی بیٹی لگتی تھی۔ یہ۔ اتنی سی عمر میں اتنی سنجیدہ اور خاموش۔“ اس نے بڑی خاموشی سے ان کا اپنے بارے میں تبصرہ سنا۔

”ماما آپ کی میٹ فرینڈ تھیں۔ ارجمند آئی۔“ اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا تھا۔ انہوں نے بغیر اسے دیکھے سر ہلادیا تھا۔

”پھر آپ ان کے مرنے کے تھے سات سال بعد کیوں آئیں؟“ وہ کہتے کہتے ہچکچا کر چپ ہو گئی تھی۔ انہوں نے حوصلہ دینے والے انداز میں اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔ ایسے جیسے اس سے کہنا چاہ رہی ہوں کہ تم جو دل میں آئے بلا تکلف کہہ سکتی تھیں۔ یہ ان کے اسی انداز نے اسے حوصلہ دیا تھا تب ہی وہ آگے بولی۔

”آپ کو کیا یہ بات معلوم تھی۔“ اس نے ہنسی میں کہا۔ اس کا سوال انہوں نے سکون سے سنا تھا اور پھر سر ہلادیا تھا۔

”پھر بھی آپ یہاں نہیں آئیں۔ اتنے سالوں میں کبھی کوئی فون نہیں کیا، کوئی خط نہیں لکھا۔“ وہ بے جھجک اپنے دل میں آئی بات کہتی۔

”کیسے آتی میں یہاں نہیں تھی۔ تم حوصلہ نہیں تھا کہ یہاں آ سکتی۔ اس گھر میں جہاں ضوفی کے ساتھ بیٹھے میں نے اپنے بچپن کا حیرت انگیز گھر۔ اس گھر کے کونے کونے میں ہمارے بچپن کی بے شمار یادیں

بکھری ہوئی ہیں۔ یہ لاؤنج ہو کچن ہو ڈائننگ روم، لان اسٹڈی، صوفی کا بیڈروم، میں ان سب کو دیرا کس طرح دیکھ پاتی۔ میں آتی تو وہ مجھ سے تعزیت کرتے میری دوست کے مرنے پر افسوس کرتے ہیں تو آج تک خود اپنے آپ سے اس کے مرنے پر افسوس نہیں کر سکی۔ اس عرصے میں کبھی آنٹی سے بھولے بسرے بھی رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میں تمہیں کیا بتاؤں فری! کہ وہ مجھے کتنی پیاری تھی۔ آج اتنے برسوں بعد جب میں بمشکل خود کو اس جگہ پر لائی ہوں تو میرا دل چاہ رہا ہے ان دیواروں سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روؤں۔ ان سے کہوں میرا وہ بچپن لوٹا دو وہ میری پیاری دوست صوفشاں کہاں ہے۔ اسے کہیں سے لے آؤ۔ ایسا کبھی ہوا ہی نہیں کہ میں اس گھر میں آئی ہوں اور یہاں صوفی نہ ہو۔ اس کے بغیر یہ گھر مجھے گھر نہیں ایک کھنڈر لگ رہا ہے۔ دل چاہ رہا ہے جلد سے جلد یہاں سے بھاگ جاؤں۔ میں شاید یہاں کبھی نہ آتی لیکن صرف تمہاری وجہ سے آئی ہوں فری۔ تمہاری شکل اس سے بالکل مختلف ہے۔ لیکن پھر بھی مجھے تم میں اس کا عکس نظر آ رہا ہے۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گی اس سے پہلے کئی بار ایسے مواقع آئے جب خاندان کی کسی شادی یا کسی عزیز کے انتقال پر میرا کراچی آنے کا پروگرام بنا، لیکن ہر بار میری ہمت ٹوٹ جاتی تھی ایسا تو ہو نہیں سکتا تھا کہ میں یہاں آؤں اور تم لوگوں سے نہ ملو اس لیے میں یہاں آنے کو نالتمی رہی اور اب جب میں یہاں آئی ہوں تو یہ آنا مجھے بہت دنوں تک نڈھال رکھے گا۔“ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

”تم سوچ رہی ہو گی کہ آنٹی اتنی بڑی ہو کر بچوں کی طرح رو رہی ہیں۔“ وہ تصدأ مسکرائیں اور پھر اپنی آنکھیں خشک کرنے لگی تھیں۔ نانی ای چائے لے کر آ گئیں۔

”پڑھنے نہیں جاؤ گی فری؟“ نانی امی نے اسے یاد دلایا تھا۔ اس کی سعد کے گھر جانے والی عادت آج بھی برقرار تھی۔ حالانکہ اب وہ کالج میں آچکا تھا۔ لیکن وہاں جانا اور ساتھ بیٹھ کر پڑھنا اب بھی اس کی روٹین میں شامل تھا۔

”آج میرا موڈ نہیں ہے۔ ارجمند آنٹی آتی ہیں ناں اس خوشی میں چھٹی۔“ وہ لاپرواہی سے بولی پھر سچے خیال آنے پر ان سے معذرت کرتی ہوئی اٹھی۔

”میں سعد کو فون کر کے بتا دوں وہ میرا انتظار کر رہا ہوگا۔“ سعد سے بات کرنے میں بمشکل دو تین منٹ لگے تھے اور وہ واپس لاؤنج میں آ گئی۔

”تم فری سے صوفشاں کی شادی اور اپنے انکل کی ناراضی کے بارے میں کچھ مت کہنا۔ بہت کوشش

کر کے میں نے اسے ان تمام باتوں سے دور رکھا ہوا ہے۔“ نانی امی کی آواز سن کر وہ دوبارہ دروازے کی اوٹ میں ہو گئی۔

”کیوں آئی؟ آپ اس سے یہ سب کب تک چھپائیں گی۔ کبھی نہ کبھی اسے کسی نہ کسی سے سب کچھ پتا چل ہی جائے گا۔ بلکہ میں سمجھتی ہوں اسے کچھ کچھ اندازہ تو ہوگا ہی اصل بات کا اب وہ اتنی چھوٹی بھی نہیں ہے کہ اس سے کوئی بات چھپائی جائے اور وہ اسے جان نہ سکے۔ بجائے اس کے کہ کوئی دوسرا وہ تمام باتیں اسے کسی غلط انداز میں بتائے آپ خود اسے سب کچھ صحیح صحیح بتادیں۔ ہر بچہ اپنے ماں باپ کو سب سے اچھا اور بہترین انسان سمجھتا ہے۔ ایسا ہی یقیناً وہ بھی سمجھتی ہوگی۔ کسی اور نے اسے کسی غلط طریقے سے وہ تمام باتیں بتائیں تو اس کا ذہن کتنی بری طرح منتشر ہوگا۔ ماں باپ کے آئیڈیل بنائے ہوئے بت ٹوٹیں گے اور وہ خود بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے گی۔ میں نے تو اتنی سی دیر میں محسوس کیا ہے کہ فریعام بچوں سے بہت مختلف اور بڑی حساس لڑکی ہے۔ اگر کل آپ کے کسی رشتہ دار نے یونہی مزہ لینے کے لیے اس کہانی کو کسی مختلف انداز اور پیرائے میں اسے سنایا تو اسے سخت تکلیف ہوگی۔“ ارجمند آئی کی انداز بہت مدلل اور ٹھوس تھا۔

نانی امی ان کی بات کے جواب میں کچھ بولے بغیر ایک ٹھنڈی سانس لے کر چپ ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد وہ واپس لاؤنج میں آ گئی۔ اس کے آنے پر وہ دونوں ہنستی مسکراتی کسی دوسرے ٹاپک پر باتیں کرنے لگیں۔

”آپ نے بھی ماما کی طرح جرنلزم پڑھا ہے۔“ اس کا دھیان کچھ دیر پہلے والی باتوں سے ہٹا نہیں تھا، لیکن بظاہر وہ بڑی پرسکون تھی۔ وہ اس کا سوال سن کر مسکرا دیں۔

”ایڈیشن تو میں نے اور صوفی نے ایک ساتھ لیا تھا یونیورسٹی میں لیکن بس اچانک ہی میری شادی طے ہو گئی اور جرنلزم پڑھنے کا خواب شادی کی نذر ہو گیا۔ پھر شادی ہوتے ہی میں لندن چلی گئی۔“

اپنی شادی کے ذکر کے ساتھ ہی انہیں پھر ضوفشاں یاد آ گئی۔ کس طرح اس نے ان کی شادی کے تمام فنکشنز میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور رخصتی کے وقت کس طرح رونادھونا مچایا تھا۔ ارجمند آئی شام تک رکتی تھیں اور شام تک اسی طرح گزرے کل کی مختلف باتیں کبھی ہنسنے اور کبھی اداس ہوتے دہراتی رہیں۔

”جانے سے پہلے میں ملنے آؤں گی۔“ گیٹ پر تہا حافظ کہتے ہوئے انہوں نے اسے اور نانی امی کو بیک وقت مخاطب کیا۔ ان کے جانے کے بعد وہ بہت کچھ سوچتی اور الجھتی رہی۔

نانا امی نے سرسری انداز میں بھی ارجمند آئی کے آنے کا ذکر نانا امی سے نہیں کیا۔ وہ ان کی اکلوتی بیٹی کی سب سے عزیز دوست تھی۔ اس کے انتقال کے بعد پہلی مرتبہ آئی تھی مگر انہوں نے اس بات کا تذکرہ ان سے کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا حالانکہ خود وہ بہت چپ اور روئی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

نانا ابانے ان کے روئے ہوئے چہرے کو بغور دیکھا بھی تھا مگر بولے کچھ نہیں تھے۔ ان سے رونے کا سبب بھی نہیں پوچھا تھا۔ پتا نہیں وہ اتنے بے حس کیوں تھے۔ وہ جیسے جیسے بڑی ہو رہی تھی اسے نانا ابانے کی بے بسی اور سرد مہری حد سے زیادہ بری لگنے لگی تھی۔ صرف اسی کے ساتھ نہیں بلکہ نانا امی کے ساتھ بھی وہ اتنی مختصر اور نپتی تلی بات کرتے کہ اسے ان سے چڑھنے لگتی۔ اسے نانا ابانے بہت متکبر اور ظالم انسان لگتے تھے۔ وہ اپنے علاوہ کسی اور کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔ دوسروں کے احساسات اور دکھ درد ان کے نزدیک بے کاری باتیں تھیں جن پر وہ اپنا قیمتی وقت برباد نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ڈرتی تو وہ ان سے ہمیشہ ہی تھی۔ ان سے اجنبیت بھی ہمیشہ محسوس کی تھی۔ مگر اب کچھ عرصہ سے اسے ان سے نفرت سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اگر کسی شخص کے بارے میں آپ کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ وہ آپ کے ماں باپ کو ناپسند کرتا ہے اس حد تک ان کا نام سننا بھی گوارا نہیں کرتا تو ایسے شخص سے نفرت کے علاوہ کیا کیا جاسکتا ہے۔

رات میں اس نے ارجمند آئی کو فون کیا وہ اپنے سسرال میں ٹھہری ہوئی تھیں اور تانی امی کو خاص طور پر وہاں کا فون نمبر دے کر گئی تھیں۔ نانا امی عشاء کی نماز پڑھ رہی تھیں اسے یہ وقت ان سے چھپ کر فون کرنے کے لیے آئیڈیل لگا۔

”میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں ارجمند آئی! لیکن گھر پر نہیں، میں اپنے ماما پاپا کے بارے میں سب کچھ جانتا چاہتی ہوں، وہ سب جو نانا امی مجھ سے چھپانا چاہتی ہیں۔“ ان کے محبت بھرے انداز نے اسے اتنا حوصلہ دے دیا تھا کہ وہ بے جھجک پر اعتماد طریقے سے ان سے یہ بات کہہ گئی تھی۔

”تین دن تو میں شادی میں بڑی ہوں۔ ایسا کرتے ہیں سڑکے کو تمہارے اسٹول کی بھی چھٹی ہوتی ہے، میں اس روز تمہارے گھر آ جاؤں گی پھر آئی سے کہیں گھومنے پھرنے کا کہہ کر ہم دونوں باہر چلیں گے۔ ٹھیک ہے۔“ انہوں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد سارا پروگرام ترتیب دے لیا۔

اسے ارجمند آئی کا یہ انداز بہت اچھا لگا۔ وہ اسے بچہ نہیں سمجھ رہی تھیں۔ اس سے وہ سب باتیں چھپا نہیں رہی تھیں جو جاننا اس کا حق تھا۔ یہ سب جو اس کے ماما پاپا کی کہانی تھی اور جس کا وہ بھی ایک کردار تھی۔ وہ میٹرک اسٹوڈنٹ تھی۔ اور اب اتنی چھوٹی ہرگز نہیں تھی کہ اس سے خود بھی کے ماں باپ کے

۱۱ سے میں کوئی بات چھپائی جائے۔



بہت کے دن ارجمند آئی وعدے کے مطابق آگئی تھیں۔ نانی امی اتنی نا سمجھ نہیں تھیں کہ ان کے اسے ساتھ لے جانے کا مقصد سمجھ نہ سکیں، لیکن وہ انہیں منع نہیں کر سکیں۔ وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ گئی تھیں۔ ارجمند آئی نے ڈرائیور سے کسی بھی پرسکون سی جگہ پر لے جانے کے لیے کہا۔ راستہ بھر وہ اس کے ساتھ اپنے بچوں کے بارے میں باتیں کرتی رہیں۔ ساحل پر لوگوں کا کوئی خاص رش نہیں تھا۔ وہ دونوں اطمینان سے واک کرتی آتی جاتی لہروں کو بغور دیکھ رہی تھیں۔

”نانا ابامیری ماما سے نفرت کیوں کرتے ہیں اور ارجمند آئی! پسند کی شادی کرنا اتنا بڑا جرم تو نہیں۔“
”بھئیے نہیں، وہ اچانک ان سے پوچھ بیٹھی۔

”وہ تمہاری ماما سے نفرت نہیں کرتے فری! تم انکل کو مس انڈر اسٹینڈ کر رہی ہو۔“ وہ اس کا ہاتھ تھامتے دیکھنے لہجے میں بولی تھیں۔

”جب ہم کسی سے بہت محبت کرتے ہیں اس پر اپنا حق سمجھتے ہیں۔ ہمیں مان ہوتا ہے اس پر یقین ہوتا ہے کہ ہمیں کبھی مایوس نہیں کیا جائے گا اور پھر اگر وہ یقین اور مان ٹوٹ جائے تو دل اسی طرح ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ تم نے وہ سب نہیں دیکھا جو میں نے دیکھا ہے۔ میں نے دیکھی ہے وہ والہانہ محبت جو انکل ضوفی سے کرتے تھے۔ اپنی ساری زندگی میں نے کسی باپ کو بیٹی سے اتنی شدید محبت کرتے نہیں دیکھا۔ ہم سب دوستیں ضوفی پر رشک کرتی تھیں۔ اس کی کوئی فرمائش جو انکل رد کر دیں۔ اس کی آنکھ میں ایک آنسو تک انہیں برداشت نہیں تھا۔ وہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ان کی کل کائنات۔ وہ اس کے ساتھ بالکل دوستوں کی طرح رہتے تھے۔ خود وہ بھی انکل کی دیوانی تھی۔ انکل تو جیسے اس کے آئیڈل تھے۔ بیٹیاں ماؤں کے زیادہ قریب ہوتی ہیں مگر وہ آئی کے برخلاف انکل کے بہت نزدیک تھی۔

ایگزیز ہوتے اور وہ پڑھنے کے لیے رات کو جاگ رہی ہوتی تو وہ خود بھی اس کے ساتھ رات رات بھر جاگا کرتے تھے۔ پھر آفس کی چھٹی کر کے اسے خود چھوڑنے آتے۔ جتنی دیر پیہر ہوتا وہ باہر گاڑی میں بیٹھے اس کے لیے دعائیں کرتے رہتے تھے۔ ہم لوگ حیران ہوتے کہ انکل تین گھنٹے اکیلے گاڑی میں بیٹھے بور نہیں ہو جاتے۔ وہ ہماری حیرت پر فخریہ انداز میں مسکراتی تھی۔

میں تو اس کی سب سے خاص دوست تھی اور اسی حوالے سے آئی انکل کے لیے بھی بہت خاص تھی۔

بہت زیادہ آنا جانا تھا ہمارا ایک دوسرے کے گھر۔ انگل آفس سے تھکے ہارے گھر لوٹتے اور وہ یونہی سرسری سا ہی ذکر کر دیتی کہ ”پاپا فلاں جگہ بہت اچھی ایگزپیشن لگی ہے“ یا ”فلاں نیار یسٹورنٹ آج کل بڑا مشہور ہو رہا ہے۔“ تو وہ فوراً اس جگہ جانے کے لیے کھڑے ہو جاتے۔

وہ خود ان کی تھکن کا خیال کر کے جانے سے منع کرتی بھی تو وہ کہتے کہ ”تمہارے ساتھ جا کر تو میں فریض ہو جاؤں گا۔“ ساری پیاری بیٹی ساتھ ہو تو میں کبھی تھک نہیں سکتا۔“ میں تمہیں کیا کیا بتاؤں فری۔ ایسی محبت نہ کہیں دیکھی نہ سنی، قصے کہانیوں جیسی وہ خود انگل کی اس محبت کے جواب میں ان سے اتنی ہی شدید محبت کرتی تھی۔

چھٹیوں میں ایک بار وہ آئی کے ساتھ اسلام آباد چلی گئی تھی۔ تو دو چار دن میں ہی انگل کو بری طرح مس کرنے لگی۔ اور روتے دھوتے فوراً واپسی کا پروگرام بنا لیا۔ انگل یہ سن کر کہ یہ بغیر گھومے پھرے واپس آ رہی ہے۔ اپنے سب کام چھوڑ چھاڑ بیٹی کے پاس پہنچ گئے۔ میں ان سب باتوں کی گواہ ہوں فری۔ میں نے وہ کہانیاں اور داستانوں میں رقم ہونے کے لائق محبت اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے اور بار بار صوفشاں کے نصیب پر رشک بھی کیا ہے۔

”ضوئی تم بہت خوش قسمت ہو۔ انگل تم سے اتنا پیار کرتے ہیں۔ کاش میرے ڈیڈی بھی یونہی میرا خیال رکھتے۔ میں اکثر اس سے کہا کرتی تھی۔“ ارجمند آئی بولتے بولتے کہیں کھو گئی تھیں۔

نانی امی نے جب ایک بار اسے ماما اور نانا ابا کی اس والہانہ محبت کا بتایا تھا اور نانا ابا کا رویہ اس نے اس کے قطعاً برعکس دیکھا تو ان کی باتوں کو جھوٹ قرار دے دیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ اس سے جھوٹ بولتی ہیں۔ شاید اس کا دھیان اس نفرت سے ہٹانے کے لیے جو نانا ابا اس کی ماما سے کرتے ہیں، لیکن ارجمند آئی کی باتیں تو ان تمام باتوں پر مہرِ تقدیرِ مثبت کر رہی تھیں۔

”ہم لوگ انٹر میں تھے جب اس کی منگنی ہو گئی تھی۔ شجاع بھائی کے ساتھ۔ وہ اس کے سگے چچا زاد تھے۔ تمہاری ماما کی فیملی میں خاندان سے باہر شادی کرنے کا کوئی تصور نہیں۔ خاندان کی اس روایت کے برخلاف انگل نے صوفشاں پر اس حوالے سے کوئی دباؤ نہیں ڈالا تھا۔

وہ خاندان کی ایسی روایت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے جو ان کی بیٹی کی خواہش کے مطابق نہ ہو۔ یہی وجہ تھی کہ جب شجاع بھائی کا پرپوزل آیا تو انہوں نے ضوئی کو فیصلہ کرنے کی پوری پوری آزادی دی۔ لیکن ضوئی آخر کار انکار کرتی ہی کیوں؟ شجاع بھائی کو انگل بہت پسند کرتے تھے۔ ان کے بہت

سے کہتے تھے: بھتیجیوں میں شجاع بھائی کی خاص جگہ اور مقام تھا، انکل انہیں اپنا بیٹا کہا کرتے تھے۔ وہ تھے بھی بہت قابل ذہین اور سلجھے ہوئے۔ انکل نے فیصلہ مکمل طور پر اس پر چھوڑ دیا تھا اور ضوفی نے وہی فیصلہ کیا تھا جو اس کے پاپا کی بھی خواہش تھا۔

انکل بیٹی کی اس فرماں برداری پر خوشی سے نہال ہو گئے تھے۔ بہت دھوم دھام سے اس کی منگنی ہوئی تھی، شجاع بھائی کے ساتھ۔ ضوفی اس رشتے پر بہت خوش تھی۔ اسے شجاع بھائی کی اپنے لیے پسندیدگی کا بھی اندازہ تھا۔ منگنی کے بعد جب اس کی شجاع بھائی سے بات ہوئی تو اسے پتا چلا کہ وہ اسے صرف پسند نہیں کرتے تھے بلکہ اس سے محبت کرتے تھے اور اس رشتے کے بھیجے جانے میں بڑوں کی پسند سے بھی بڑھ کر ان کی پسند اور مرضی شامل تھی۔

یہ سب باتیں جان کر وہ فطری طور پر خوش ہوئی تھی۔ جس شخص اور جس گھرانے سے اس کی زندگی وابستہ کی گئی تھی وہ لوگ اسے چاہ رہے تھے اس سے بڑھ کر ایک لڑکی اور کیا چاہ سکتی ہے۔ شجاع بھائی کی اعلیٰ تعلیم اور نفیس عادات کی وجہ سے بطور کزن تو اس نے ہمیشہ ہی پسند کیا تھا اب اس رشتے میں بندھ کر انہیں مزید پسند کرنے لگی تھی۔

مگر کاتب تقدیر تو کچھ اور ہی سوچے بیٹھا تھا۔ جو کچھ ہوا اگر وہ نہ ہوتا تو بہت اچھا تھا۔ مگر اس سب کو ہونے سے کون روک سکتا تھا۔ یہ سب تو تقدیر میں لکھا جا چکا تھا، میں شادی کے بعد لندن چلی گئی تھی۔ مگر ہماری دوستی ویسی ہی تھی۔ ہمارا آپس میں مسلسل رابطہ رہتا تھا۔ اس کا ایم اے کا فائل ایئر چل رہا تھا۔ اس کا ڈیپارٹمنٹ یونیورسٹی کی طرف سے پاکستان نور پر گیا تھا۔ وہ تو تھی بی سیر و تفریح کی دلدادہ سوا اس کا ہانا تو لازمی تھا۔ وہیں تمہارے پاپا سے اس کی پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ پاکستان، انڈیا اور نیپال وغیرہ کے پہاڑی سلسلوں کی سیاحت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ ان دونوں کی پہلی ملاقات بہت افسانوی انداز میں ہوئی تھی۔ وہ اپنے کلاس فیلوز کے ساتھ شور مچاتی اور حسب عادت شرارتیں کرتی ایک پہاڑ پر چڑھ گئی تھی۔

اکثر لڑکیاں خوف کے مارے نیچے ہی رک گئی تھیں۔ صرف اس کی جیسی دو تین ہی اور تھیں جو لڑکوں کے ساتھ کوہ پیمائی کا شوق پورا کر رہی تھیں۔ ہنستے اور باتیں کرتے وہ لوگ اوپر چڑھ گئے تھے۔ اس پہاڑ کے دوسری طرف بہت گہری جھیل تھی۔ ضوفی باتیں کرتے ہوئے بے دھیانی میں بالکل کنارے پر کھڑی ہو گئی تھی۔ اچانک اس کے پیر کے نیچے سے کوئی پتھر سر کا تھا یا وہ کسی وجہ سے تو وزن برقرار نہ رکھ سکی تھی۔ جو

اس کا پیر سلپ ہو گیا تھا۔ اسے گرتا دیکھ کر سب کے منہ سے چیخیں نکل گئی تھیں۔

سب چیخ چلا رہے تھے۔ مگر اتنی ہمت کسی میں بھی نہیں تھی کہ اتنے اونچے پہاڑ سے اسے بچانے کے لیے ایک انتہائی گہری جمیل میں چھلانگ لگا کر خود موت کو آواز دے۔

”تمہارے پاپا بھی اپنے دوستوں کے ساتھ وہیں موجود تھے۔ اور اسنو ڈفس کے اس گروپ کی شرائطوں کو بہت دیر سے انجوائے بھی کر رہے تھے۔ اور ان سب کے درمیان سب سے نمایاں وہ شوخ سی لڑکی پہلی ہی نظر میں ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کروا گئی تھی۔ اس کی شوخی، شہزادت اور زندہ دلی انہیں لمحہ بھر میں تسخیر کر گئی تھی۔ اسے گرتا دیکھ کر وہ ایک پل ضائع کیے بغیر پانی میں کود گئے تھے اور پھر بحفاظت اسے وہاں سے نکال لائے تھے۔ اس کے بہت سے دوستوں میں سے کوئی اس کی جان بچانے نہیں آیا تھا اور جو آیا اسے وہ جانتی تک نہیں تھی۔

کون تھا وہ جس نے اس کی خاطر اپنی جان کو خطرے میں ڈالا تھا اسے تو اس نے پہلے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔ ان کی یہ دلیرانہ ادا ہی شاید اس کے دل کو بھانگی تھی۔ یہ تھا نقطہ آغاز اس داستانِ محبت کا جس نے ان دو اجنبی دلیس کے باسیوں کو پھر زندگی بھر ایک دوسرے کے ملاوہ کچھ سوچنے ہی نہیں دیا۔ اسپین کا رہنے والا البرٹ فرانس اور پاکستان سے تعلق رکھنے والی صوفشاں فاروق البرٹ جو پیشے کے لحاظ سے انجینئر تھا اور جس نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ وہ کسی غیر ملکی لڑکی سے شادی کرنے جیسا بڑا فیصلہ کر ڈالے گا اور صوفشاں جو منگنی کے بعد اب ایک شخص کے ساتھ خود کو زندگی بھر کے لیے وابستہ کر چکی تھی اس نے بھی کبھی ایسی طوفانی محبت کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ وہ ایک واقعہ، شکر یہ اور تعارف کے مراحل طے کر لیا ہوا جلد ہی دوستی اور پھر محبت میں تبدیل ہو گیا تھا۔ یا یوں کہہ لو کہ ابتدائی طور پر ان دونوں نے اس محبت کو اتنی سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ ورنہ سچ تو یہ تھا کہ وہ دونوں پہلی نظر میں ہی ایک دوسرے کے اسیر ہو گئے تھے۔ وہ تفریحی ٹوران دونوں کی زندگیوں کی بدل گیا تھا۔ وہ دو الگ الگ جگہوں اور معاشروں سے تعلق رکھنے والے ایک جیسی سوچ، ایک جیسی عادتیں اور ایک جیسی پسند رکھتے تھے اور اب ایک دوسرے کی محبت میں بری طرح مبتلا ہو چکے تھے۔

مجھے یاد ہے صوفی نے وہاں سے آ کر جو تفصیلی خط مجھے لکھا تھا۔ اس میں اس یارے میں کیا لکھا تھا۔

”ارجمند! مجھے حیرت ہوتی ہے البرٹ پر جو بات ابھی میں سوچ ہی رہی ہوتی ہوں، وہ میرے کہنے سے پینے سے سمجھ لیتا ہے۔ پتا نہیں ایسا کس طرح ہو جاتا ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے کنبے بغیر ایک

دوسرے کی ہر بات سمجھ لیتے ہیں۔ کیا یہی محبت ہوتی ہے؟ ایسا میں نے شجاع کے لیے کبھی محسوس نہیں کیا۔ کبھی اس کا فون آنے پر اس سے ملنے پر میرا دل اس انداز سے نہیں دھڑکتا۔ میں خود کو البرٹ کے پاس ہانے سے روکنا چاہتی ہوں۔ مجھے بتا ہے وہ میرا ہم مذہب نہیں۔ اس کا اور میرا کلچر بالکل مختلف ہے اور سب سے بڑی بات کہ میری منگنی ہو چکی ہے لیکن اس معاملے میں میں خود اپنے آپ کو کچھ سمجھانے سے قاصر ہوں۔“

وہ دونوں بری طرح ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے تھے۔ البرٹ نے ضوفی کے سامنے شادی کا پوچھنا رکھا تھا۔ وہ مذہب کے علاوہ اس کی کسی بات پر معترض نہیں تھی۔ وہ ایک معزز کرپین فیملی سے تعلق رکھتا تھا اس کے والد کا اس کے بچپن میں ہی انتقال ہو چکا تھا لیکن اس کی ماما زندہ تھیں اور وہ دونوں ماں بیٹا ساتھ رہتے تھے۔ وہ ضوفی سے شادی کرنے کی خاطر مسلمان ہونے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ ضوفی کبھی قہمی اس کی یہ محبت پاگل پن نہیں۔ اس نے ایک بہت اچھے اور محبت کیے جانے کے قابل شخص کے سامنے اپنا دل باراہے۔ اسے یقین تھا کہ یہ شخص اسے زندگی میں کبھی مایوس نہیں کرے گا۔

میں نے اسے سمجھانا چاہا تھا مگر محبت سمجھنا شروع کر دے تو وہ محبت کہلائے ہی کیوں۔ اسے میری کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اسے بس یہ بتا تھا کہ البرٹ اس سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ وہ اس کے لیے اپنا مذہب تک چھوڑنے کے لیے تیار ہو گیا ہے اور اس شخص کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتی۔ بہت جنونی محبت تھی ان دونوں کی۔

آنٹی اور انکل دونوں فرماں بردار بیٹی کی اس انوکھی ضد پر صدمے سے نڈھال ہو گئے تھے۔ شاید انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ان کی بیاری بیٹی یوں تنہا اتنا بڑا فیصلہ بھی کر سکتی ہے۔ ایک ایسا فیصلہ جو ماں باپ کو ذلت کے علاوہ کچھ نہیں دے سکتا تھا۔ سارے خاندان کے سامنے اس کی دھوم دھام سے منگنی کی تھی انہوں نے اور اب جب اس کی شادی کا وقت بالکل نزدیک آچکا تھا تو وہ اس طرح والدین کی عزت کا ٹٹا بنا رہی تھی۔

ابتدا تو انکل بالکل خاموش ہو گئے اور آنٹی ضوفی پر خوب چیخنی چلائیں۔ اسے برا بھلا کہا۔ پھر انکل نے سوچا یوں خاموش ہو جانے اور خفگی کا اظہار کرنے سے تو بات نہیں بنے گی۔ وہ نا سمجھ تھی۔ یہ لوگ تو نا سمجھ نہیں تھے۔ انہوں نے پیار محبت سے اسے سمجھانے اور قائل کرنے کا سوچا۔ ظاہری بات ہے وہ اس رشتے کے لیے کسی طرح بھی راضی نہیں ہو سکتے تھے۔

پہلے کرنے کی گٹھری میں ایک بیٹی نے باپ کی محبت پر اس شخص کی محبت کو ترجیح دی تھی جسے اس کی زندگی میں آئے انہی کچھ ہی غرصہ ہوا تھا۔ وہ برسوں کی محبت رفاقت وہ انمول چاہت سب لہجوں میں ختم ہو گئی تھی۔ بیٹی نے باپ کا انتخاب نہیں کیا تھا۔ وہ دونوں محبتیں جب ترازو میں رکھی گئیں تو باپ کی اتنے ماؤں کی والہانہ چاہت اس انجان آدمی کی چاہت کے آگے وزن میں ہلکی پڑ گئی تھی۔

وہ اس لہوٹ گئے تھے فری! انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ان کی عزیز از جان بیٹی ان کے علاوہ کسی اور کا خطاب بھی کر سکتی ہے۔ بس پھر انہوں نے اس سے کچھ نہیں کہا تھا۔ ایسے جیسے اب کہنے کو کچھ بچا ہی نہ ہو۔ وہ بالکل خاموش ہو گئے تھے۔ آنٹی بہت روئی تھیں اس بات پر، لیکن انہوں نے انہیں بھی چپ کروا دیا تھا۔ مگنی نوٹے پر شجاع بھائی اور ان کے والد تو اتنے ناراض نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے اس ساری صورت حال کو بڑے حوصلے سے قبول کر لیا تھا۔ مگر ان کی امی نے اسے اپنی بے عزتی اور ذلت سمجھتے ہوئے صوفی اور آنٹی انکل کو بہت برا بھلا کہا تھا۔ اور پھر اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے صوفی کی مادی سے پہلے ہی شجاع بھائی کی شادی کر ڈالی تھی۔ خاندان کے لوگوں کا اس بات پر جو رد عمل ہو سکتا تھا وہی ہوا تھا۔ فاروق احمد کی اکلوتی اور لازمی بیٹی ایک کرچین سے شادی کرنے جا رہی تھی۔ اپنی برسوں والی مگنی تو ڈر کر اور والدین کا سر جھکا کر۔

ایک ایسے شخص کو کوئی مسلمان ماننے کے لیے تیار ہی نہیں تھا جو صرف صوفیاں فاروق سے شادی کرنے کے لیے مسلمان ہوا تھا۔ تمہاری ماما اپنے باپ کے گھر سے ہی رخصت ہوئی تھیں فری۔ تمہارے نانا ابا نے خود اس کی شادی کروائی تھی۔ خاندان کے بہت قریبی لوگوں کو مدعو کر کے ایک مختصر سا فنکشن کیا تھا انہوں نے۔ جس میں صوفیاں فاروق کا نکاح اور رخصتی ہوئی تھی۔ اگر جو اس کی باقاعدہ دھوم دھام سے شادی ہوتی تو وہ اکلوتی بیٹی کو خوب عالی شان جہیز دیتے۔ ان کے پاس جو کچھ تھا وہ بیٹی کے لیے تھا۔ مگر اب انہوں نے وہ سب چیک کی صورت میں بڑی خاموشی سے اسے دے دیا تھا۔

”تم ہمارے لیے مرنے ہو صوفیاں! اب کبھی پلٹ کر یہاں ہرگز مت آنا۔ آج سے اس گھر کے دروازے تم پر ہمیشہ کے لیے بند ہیں تم اپنی زندگی میں خوش رہو یا ناخوش رہو، ہمارا اب تم سے کوئی واسطہ نہیں۔ بھول جانا کہ تمہارے کوئی ماں باپ تھے۔ سمجھ لینا ہم مر چکے ہیں۔“ رخصت کرتے ہوئے انہوں نے یہ آخری بات اس سے کہی تھی۔ اور یہ واقعی ان دونوں کی آپس میں آخری بات تھی۔

وہ رخصت ہو کر الہٰ ربنا جو اب مسلمان ہونے کے بعد عبدالرحمن تھا کے ساتھ اسپین چل گئی تھی۔ خط و

کتابت کے ذریعے ہم دونوں ایک دوسرے کے حالات سے واقف رہتے تھے۔ شادی کے چند ماہ بعد وہ دونوں لندن آئے تھے میرے پاس۔ وہ دونوں بہت خوش تھے۔ تمہارے پاپا واقعی بہت اچھے تھے۔ ضوفی نے ان کی جو تعریفیں کی تھیں وہ سب سچ تھیں۔ ان کی پچھلی زندگی چاہے جیسی بھی رہی ہو لیکن ضوفشاں کے ساتھ وہ انتہائی حدوں تک مخلص تھے۔

وہ اس کا اس طرح خیال رکھتے جیسے وہ کوئی کانچ کی گڑیا ہے۔ اس کی ذرا سی خاموشی یا اداسی بھی انہیں برداشت نہیں تھی۔

ضوفی اس محبت پر تازاں تھی۔ اس کی جس محبت کو سب پاگل پن اور جذباتی و احمقانہ فیصلہ قرار دے رہے تھے وہ محبت تو اس کی سوچ کے عین مطابق بہت سچی اور خالص تھی۔ تمہارے پاپا بہت کامل مسلمان تو نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے تو صرف ضوفشاں سے شادی کے لیے مسلمان ہونا قبول کیا تھا، لیکن شادی کے بعد ضوفشاں ہی کے خاطر بہت سے ایسے کام کرنے انہوں نے ترک کر دیے تھے جو بحیثیت مسلمان انہیں نہیں کرنے چاہیے تھے۔ ان کے گھر میں شراب کا نام لیا جانا بھی ممنوع تھا۔ وہ بہت خوش تھی عبدالرحمن کے اپنی خاطر تبدیل ہو جانے پر اس بات پر کہ اس کی محبت اتنی زور آور ہے کہ وہ شخص اس کے لیے کچھ بھی ترک کر سکتا ہے۔ اس خوشی کا اظہار وہ اپنے خطوں اور فون کالز میں کیا کرتی تھی۔ لیکن پھر بھی پتا نہیں کیوں مجھے وہ خوش نہیں لگتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ خوشی کا صرف اظہار کرتی ہے لیکن دور حقیقت وہ خوش ہے نہیں۔ کئی بار میں نے مختلف طریقوں سے اس سے پوچھا کہ یہ لڑکھائی ہے یا کہ اس کی زندگی میں کوئی ٹینشن تو نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ عبدالرحمن کا رویہ اس کے ساتھ بدلنے لگا ہے۔ مگر ایسی کوئی بات میرے علم میں نہیں آسکی جو اسے ناخوش کرنے کا باعث بن رہی تھی۔

آہستہ آہستہ خط و کتابت میں کمی ہوتی گئی۔ میرے چار پانچ خطوں کے جواب میں کئی ماہ گزرنے کے بعد اس کا مختصر سا خط آتا۔ وہ بھی اس طرح لگتا جیسے کوئی رسم بھائی گئی ہو۔ تب تم پیدا ہو چکی تھیں۔ میری اپنی شادی شدہ زندگی تھی۔ اس کے لیے میں بہت سی تشویش رکھنے کے باوجود اس بارے میں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

پھر اتفاق ایسا ہوا کہ مجھے اسپین جانے کا موقع ملا تم اس وقت دو سال کی تھیں۔ تمہاری دادی کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ وہ دونوں مجھ سے بہت پر تپاک انداز میں ملے تھے۔ بظاہر ان کی زندگی بہت خوشگوار نظر آ رہی تھی۔ بہترین گھر تمام آرامناشوں کے ساتھ من پسند ساتھی اور پیاری سی بیٹی۔ ان کی زندگی

میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی وہ ضوئی کہیں سوئی تھی جسے میں بچپن سے جانتی تھی۔ جو بہت زندہ دل اور شہزادی تھی۔

وہ مکمل طور پر باؤس وانف تھی۔ تمہارے پاپا کے بہت کہنے پر بھی اس نے اپنا کیرئیر بنانے یا کوئی کام کرنے کے بارے میں سوچنے سے انکار کر دیا تھا۔ گھر کی دیکھ بھال کرنا شوہر اور بیٹی کا خیال رکھنا اس کی زندگی کا محور بس یہی تھا وہ اب بھی قہقہے لگا کر ہنستی تھی لیکن اب جب وہ ہنستی تو اس کی آنکھوں میں قندیلیں روشن نہیں ہوتی تھیں۔ وہ اب بھی بے تکان بولتی اور مسکراتی تھی لیکن اب ان میں مصنوعی پن اور بناوٹ نظر آتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ خود کو خوش پوز کرتی ہے۔ وہ سب سے جھوٹ بولنے لگی تھی۔ شاید اپنے آپ سے بھی۔

”تمہاری کبھی مٹی پاپا سے بات ہوئی ارجمند؟“ ایک رات اس نے مجھ سے پوچھا تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلادیا تھا۔

”جس کی وجہ سے میرا اس گھر سے تعلق تھا جب وہ بی وہاں نہیں رہی تھی تو پھر میں اس گھر کے مکینوں سے رابطہ رکھ کر آیا کرتی۔ اگر انکل کے لیے ضوفشاں مرچکی تھی تو اس کی دوست سے ملنا اور بات کرنا بھی وہ یقیناً پسند نہیں کرتے۔“ میرے جواب نے اسے مایوس کر دیا تھا۔

”تم انکل سے معافی مانگ لو ضوئی! وہ تمہیں ضرور معاف کر دیں گے۔“ مجھ سے اس کی مایوسی دیکھی نہیں لگی تھی۔

”میں نے ایک بار فون کیا تھا ارجمند! پاپا نے میری آواز سنتے ہی ریسپورڈ رکھ دیا تھا۔ وہ اب مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے، میں اپنے پاپا کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ حالانکہ تب میں نے ان کی کمی کتنی شدت سے محسوس کی تھی۔ فری پیدا ہونے والی تھی ان دنوں اس وقت میں نے ممی اور پاپا کو ہمیشہ سے زیادہ مس کیا تھا۔ اسی لیے انہیں فون بھی کر لیا تھا۔“

فری کے پیدا ہونے سے پہلے کا تمام عرصہ میں نے انہیں شدت سے یاد کرتے ہوئے گزارا۔ وہ وقت کتنا سخت ہوتا ہے تارجمند! کہتے ہیں اس وقت جو دعا مانگی جائے وہ ضرور قبول ہوتی ہے میں نے اسی لمحہ بڑی شدت سے اللہ سے یہی دعا مانگی تھی کہ خدایا میرے پاپا مجھے معاف کر دیں۔ میری اولاد کو میرے لیے نجات کا ذریعہ بنا دے۔ اسی کی وسیلے سے مجھے میرے پاپا کی معافی مل جائے۔“

وہ میرے کندھے پر سر رکھ کر بلک بلک کر روئی تھی فری! اس کی آواز میں دکھوں اور مائل کی ایک عجیب

کیفیت تھی۔ ایسے جیسے وہ اپنی کیفیت کسی کو بھی سمجھا ہی نہیں پارہی ہو۔ پتا نہیں اس کے دل میں کیا تھا۔ وہ کیا گیا سوچا کرتی تھی۔

”ایک محبت کے پیچھے میں نے کتنی بہت سی محبتیں گنوا دی ہیں ارجمند۔ کتنے گھائے کا سودا کیا ہے۔ نے۔ یہ ایک محبت تو مجھے مل گئی ہے لیکن وہ تمام محبتیں ان کے بغیر میں کیسے جیوں میں اپنے پیچھے تاروں کسی کے سامنے اظہار تک نہیں کر سکتی۔ جو کچھ میں نے چاہا تھا وہ پالیا ہے۔ عبدالرحمن میرا محبوب میرا شوہر۔ بہت خوش ہوں میں اس کے ساتھ وہ ویسا ہی ہے جیسا میں نے اسے سمجھا تھا۔ میرے ساتھ

ہے میرا خیال رکھتا ہے۔ اگر جو اسے پتا چل جائے کہ اس سب کے باوجود بھی ناخوش ہوں تو وہ مجھ سے متنفر ہو جائے گا۔ یہی کہے گا کہ میں ایک ناشکری عورت ہوں۔ اتنی پرسکون اور آسائشوں بھری زندگی کے باوجود ناخوش ہوں۔ میں کبھی تھیکہ کبھی منافقانہ زندگی نہیں گزاروں گی۔ لیکن منافقانہ زندگی تو میرا اب بھی گزار رہی ہوں۔ شروع دن سے گزار رہی ہوں۔ اس دن سے جب رخصت کرتے ہوئے پاپا نے کہا تھا۔ تم ہمارے لیے مرگئی ہو صوفیاشاں کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں واقعی مر چکی ہوں۔ میرا دل مر چکا ہے۔ اب خوش ہونے کی بات پر بھی مجھ سے خوش نہیں ہوا جاتا۔ مئی پاپا کے بغیر زندگی کا ہر گنا پچھکا ہے ارجمند! میں ہر رات اپنے گھر کو اور مئی پاپا کو یاد کرتے ہوئے سوتی ہوں۔ صبح آنکھ کھلتی ہے تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں اپنے اسی گھر میں ہوں۔ پاپا واک کر کے واپس آنے والے ہوں گے۔ آنکھ کھلنے میں خود کو اسی جگہ میں پاتی ہوں جہاں کل رات تھی۔ وہ گھر وہ بارہت دیکھنا شاید اب میرے نصیب میں ہی نہیں۔ وہ چونکٹ میں نے اپنی خوشی سے پار کی تھی۔ سب کچھ اپنی خوشی سے چھوڑا تھا۔ یہ دیکھے بغیر کا پیچھے اس گھر کا وہ دروازہ مجھ پر ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ہے۔“

وہ اس رات مجھ سے لپٹ کر بہت روئی تھی۔ اس کا کرب مجھ سے دیکھا نہیں گیا تھا۔

واپس جاتے ہی میں نے کراچی آنٹی انکل کو فون کیا تھا۔ پہلے انکل سے بات کرنے کی کوشش کی گئی انہوں نے مجھ سے بات کرنے سے انکار کر دیا تو پھر میں نے آنٹی سے صوفی کی تمام باتیں کہیں۔ میری باتیں سنتے ہوئے سارا وقت روئی رہی تھیں۔

”میں نہیں بہت سمجھا جی ہوں ارجمند! وہ اس موضوع پر میری کوئی بات سننے پر آمادہ نہیں۔“

صوفی کے فون آنے پر جب انہوں نے اس سے بات نہیں کی تو میں ان سے لڑ پڑی تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ نہیں ماننا چاہتے نہ ملیں میں اپنی بیٹی کو نہیں چھوڑ سکتی۔ میں اس سے ضرور رملوں گی۔ تو انہوں

نے جواب میں بہت سرد جھجھے میں مجھ سے کہا تھا کہ۔

”تم ضوفاں سے ملنا چاہتی ہو تو مجھے انہیں چھوڑ دینا ہوگا۔ یا شوہر یا بیٹی۔ دونوں میں سے ایک۔ پھر اس بات کے بعد میں آگے کیا کہتی۔ میرے کہنے کو کچھ رہائی نہیں تھا۔ کاش ضوفی نے اپنے پاپا سے یوں شدت کی ہوتی، وہ تو ایسا لگتا ہے پتھر کے ہو گئے ہیں۔ خود کو ایک خول میں بند کر لیا ہے۔ نہ ہنستے ہیں نہ دلتے ہیں۔ وہ بالکل بدل گئے ہیں ارجمند! اتنے سخت اور بے لچک مجھے ایسا لگتا ہے میں ساری زندگی ہی اب اس پتھر سے سر ٹکراتی رہوں تو بھی اسے دوبارہ موم نہیں کر پاؤں گی۔“

آنٹی کا رونا مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ ان کی تڑپ اور ان کا دکھ میں سہہ نہیں پارہی تھی۔ باپ اور بیٹی کے اس جھگڑے میں وہ تو بالکل بے قصور تھیں۔“

وہ ان کو سننے میں اتنی متوہی کہ خود اپنی آنکھوں سے گرتے آنسوؤں سے انجان تھی۔

”اس واقعہ کے بعد میرا بھی ضوفی سے برائے نام ہی تعلق رہ گیا تھا۔ وہ میرے خطوط کے جواب نہیں دیتی تھی یوں لگتا تھا وہ اب کسی سے بھی ملنا نہیں چاہتی۔ انکل کی ناراضی نے اسے مایوس کر دیا تھا۔“

ارجمند آنٹی کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ وہ ایک ٹک انہیں دیکھے جا رہی تھی۔ انہوں نے کچھ ہلکے تھکے سے انداز میں اس کا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف بیٹھ گئیں۔

”تمہاری ماما اپنی شادی شدہ زندگی سے بہت خوش تھیں فری! لیکن اسے دکھ اس بات کا تھا کہ یہ خوشیاں اس نے اپنے بہت پیارے پاپا کو ناراض کر کے حاصل کی ہیں۔ وقت نے اسے مہلت نہیں دی ورنہ ایک نہ ایک دن انکل انہیں معاف کر ہی دیتے۔ والدین اولاد سے کب تک ناراض رہ سکتے ہیں۔ لیکن افسوس وہ عمر اتنی کم لکھوا کر لائی تھی کہ ماں باپ سے اپنے قصور کی معافی نہ مانگ سکی۔ وہ ان کا دل توڑ کر خود بھی ٹوٹ گئی تھی۔ کاش اسے اتنی زندگی مل جاتی کہ وہ اپنے بہت پیارے اور جان سے عزیز پاپا کو مٹا سکتی۔ اور بد قسم یہ سمجھتی ہونا فری کہ وہ تم سے نفرت کرتے ہیں تو ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اگر تم سے نفرت کرتے تو اپنے ساتھ کراچی لے کر نہ آتے۔ بس شاید ان کا مان ٹوٹ گیا ہے۔ تم ان کی ساتھ اچھی طرح رہو گی۔ ان کا کہنا مانو گی تو وہ رفتہ رفتہ تمہارے ساتھ اپنا رویہ بدل لیں گے۔ تم ان کی بیٹی کی اولاد ہو اور اولاد کی اولاد سے تو اتنی شدید محبت ہو جاتی ہے جتنی خود اولاد سے نہیں ہوتی۔“

وہ اس کا چہرہ اپنے ہاتھ میں تھا اسے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے بہت پیار سے سمجھانے لگیں۔



But Once More Aloud And Shouted My Father! Must I Stay? While O'ER Him Wreathing Fires Made Way The Fast Through Sail And Shroua'

”ماما! Casabianca جہاز پر سے بھاگا کیوں نہیں تھا؟“ وہ بے ساختہ ماما کو ٹوک گئی تھی۔ نظم سنائی ہوئی ماما اس کے سوال پر بے ساختہ مسکرائیں پھر خاموش ہو گئیں۔

”وہ جان بچانے کے لیے بھاگ کیوں نہیں رہا۔ وہ اسی جگہ پر کیوں کھڑا ہوا ہے آخر۔“ وہ جھنجھلا گئی تھی اس لڑکے کی بے وقوفی پر ماما اس کے معصومانہ سوالوں اور سادگی پر ہنس رہی تھیں۔ پتا نہیں کیوں اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کی اس ہنسی کے پیچھے بہت سے آنسو چھپے ہوئے ہیں۔

”وہ وہاں سے کیوں جاتا فری! اس کے پاپا جو اسے وہاں کھڑا کر کے گئے تھے۔ ان کے حکم کے بغیر وہ وہاں سے کیسے ہٹ جاتا۔“ ماما اس پل روٹی ہوئی کیوں لگ رہی تھیں۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی وہ ان کے بازو پر سر رکھے لیٹی تھی۔

”وہ کیا اپنے پاپا سے بہت محبت کرتا تھا؟“ اس نے معصومانہ انداز میں پوچھا تھا۔

”ہاں وہ اپنے پاپا سے بہت محبت کرتا تھا تب ہی تو ان کے حکم کے بغیر وہاں سے بلا تک نہیں۔ اپنی جگہ سے ایک انچ نہ ہٹا۔ اس نے اپنی جان کی بھی پروا نہ کی۔ وہ خود غرض نہیں تھا نا۔“ وہ اتنی آہستہ آواز میں بولی تھیں کہ وہ بددقت انہیں سن رہی تھی۔ اس نے دیکھا اس کے پاس لیٹے لیٹے ماما نے بڑی خاموشی سے اس سے چھپا کر اپنے آنسو صاف کیے تھے۔

”آپ رور ہی ہیں ماما؟ کیا Casabianca کے مرنے پر؟“ اس نے اداسی سے پوچھا تھا۔ خود اسے اس کے مرنے پر بہت افسوس ہو رہا تھا۔

”نہیں میں رو نہیں رہی۔ مجھے تو اس کا مرنا اچھا لگا فری۔ اگر وہ جان بچانے کے لیے بھاگ جاتا تو اس میں اور دوسرے لوگوں میں کیا فرق رہ جاتا۔ پھر اس پر نظمیں تو نہ کہی جاتیں۔ پھر کہیں اس کا ذکر نہ ہوتا۔ اس نے تو محبت، قربانی، وفاداری اور فرمانبرداری کی ایک روشن مثال قائم کی۔ ایسے لوگ تو بہت اچھے ہوتے ہیں فری۔ محبت کیے جانے اور ہمیشہ یاد رکھے جانے کے قابل۔“

چھ سال کی عمر میں ماما نے اسے جو بات سمجھانی چاہی تھی وہ آج اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس رات اس کے برابر میں لیٹی ماما رو کیوں رہی تھیں۔ وہ آج ان کے رونے کی وجہ سے واقف ہوئی تھی۔

”ریڈ رائیڈنگ بڈ کی ماما نے ایک باسکٹ میں رکھا اور اس سے کہا یہ نانی اماں کے گھر دے آؤ۔“ وہ ٹوٹی خوشی باسکٹ لے کر گھر سے نکلنے لگی تو ماما نے اسے سمجھایا کہ نانی اماں کے گھر جانے کی دورا سٹے ہیں۔ ایک لبا اور ایک چھوٹا لبے راستے سے جانے میں تھکن تو ہوگی لیکن وہ بے بہت اچھا اور محفوظ۔ وہاں کوئی خطرہ نہیں۔ جبکہ چھوٹے راستے سے جلدی تو پہنچ جائیں گے لیکن وہ بڑا سناں اور خطرناک ہے۔ وہاں بھڑیا بھی رہتا ہے۔ اس نے ماما کے سامنے تو سر ہلا کر یہی کہا کہ لبے راستے سے جائے گی۔ لیکن باہر نکل کر اس کا ارادہ بدل گیا۔ اس نے سوچا ماما تو یونہی کہہ رہی ہیں۔ خواہ مخواہ لبے راستے سے جا کر میں تھک جاؤں گی۔ مجھے چھوٹے والے راستے سے ہی جانا چاہیے۔ کتنی بری حرکت کی ناس نے فری! اس کی ماما کو کتنا دکھ ہوا ہوگا اس بات سے۔ ماما پاپا کی بات تو ہمیشہ مانتی چاہیے وہ اگر کچھ سمجھاتے ہیں تو ہمارے ہی فائدے کے لیے۔ انہیں اس بات سے ڈر لگتا ہے کہیں ان کے بچوں کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ وہ ہم سے اتنی محبت کرتے ہیں جتنی ہم خود اپنے آپ سے نہیں کرتے۔“

وہ ہر کہانی عجیب انداز میں سنایا کرتی تھیں۔ یہی کہانیاں جب خدیجہ آٹھی ساتیں تو سنانے کا انداز بالکل مختلف ہوا کرتا تھا۔ اسے ماما کی کہانیاں اچھی نہیں لگتی تھیں۔

”پتا نہیں ماما کہانی اتنے بور طریقے سے کیوں سناتی ہیں۔ بھی یہ بتائیں کہ آگے کیا ہوا؟ اسے راستے میں بھڑیا ماما کہ نہیں؟“ اس کی دلچسپی تو کہانی کے اگلے موڑ پر ہوتی تھی اور ماما کا انداز اتنا بورنگ اور فضول سا تھا۔

مگر یہ سوچ تب کی تھی جب فریاء عبدالرحمن بہت چھوٹی تھی۔ آج اسے نہ ان کی کوئی کہانی بور لگ رہی تھی اور نہ فضول۔ ارجمند آٹھی اسے گھر چھوڑ گئی تھیں۔ نانی امی نے اسے ڈسٹرب نہیں کیا تھا۔ وہ اکیلی کمرے میں لیٹی گزرے وقتوں کی بہت سی باتیں یاد کیے جا رہی تھی۔ ماما پاپا کے ساتھ گزارے دس سال وہ بہت سی باتیں جو اسے یاد تھیں لیکن اس نے کبھی انہیں اس انداز میں اتنی گہرائی سے نہیں سوچا تھا۔

اس کے ماما پاپا میں بہت محبت تھی وہ دونوں ایک دوسرے کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ معمولی اختلافات کے علاوہ اس نے کبھی ان کے درمیان کوئی بڑا لڑائی جھگڑا ہوتے نہیں دیکھا۔ بہت سنجیدہ اور کم گوئی اس کی ماما جو اس سے اور پاپا سے بہت پیار کرتی تھیں۔ ان دونوں کی ہر چیز کا دھیان رکھتی تھیں۔ ان دونوں کی پسند کے کھانے پکاتی تھیں۔ ان کے کپڑوں اور دیگر تمام ضروریات کا خیال رکھتی تھیں۔ اسے کبھی اندازہ ہی نہیں ہوا کہ بظاہر پرسکون اور مطمئن سی اس کی ماما اپنے دل میں کتنے غم چھپائے بیٹھی ہیں۔ کتنی

باتیں تھیں ماضی کی۔ کتنے واقعات تھے۔ جو اس وقت اس کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ماما کو اکثر اس نے ایک تصویر کو سینے سے لگا کر روتے دیکھا تھا۔ ایسا وہ اس وقت کرتی تھی جب پاپا اور خود وہ گھر پر نہ ہوتی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ وہ دوستوں کے ساتھ کھیل کر گھر جلدی واپس آ گئی۔ بھاگتی ہوئی ماما کے کمرے میں گھسی تو وہ کسی کی تصویر سے باتیں کرتے ہوئے روتی نظر آئیں۔

وہ انہیں روتا دیکھ کر گھبرا کر آگے بڑھتی تو وہ جلدی سے کچھ گھبرائے ہوئے انداز میں آنسو صاف کر لیتیں اور فوراً ہی وہ تصویر دراز میں رکھ کر اس سے جلدی سے واپس آ جانے کے بارے میں پوچھنے لگتیں۔

”آپ کس کی تصویر دیکھ رہی تھیں؟“ اسے تجسس ہوتا۔

”کسی کی بھی نہیں۔“ وہ بات بدلنے کی کوشش کرتی۔

وہ ماما سے دل ہی دل میں ناراض ہو جاتی اور پکا ارادہ کرتی کہ آج ضرور پاپا کو یہ بات بتائے گی۔ لیکن ماما کچھ ہی دیر بعد اسے کسی نہ کسی کھیل یا تفریح میں اس طرح الجھا دیتیں کہ وہ اس بات کو بھول ہی جاتی۔

ان کے گھر میں کتنی ساری تصویریں تھیں اس کے دادی دادا کی۔ پاپا کے بچپن کی اور دادی کی تو اس کی ماما کے ساتھ بہت سی تصویریں تھیں۔ گو اس کے لیے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ جس ملک کی وہ باسی تھی۔ وہاں گئے ماما باپ کوئی اہمیت نہیں رکھتے تو نانا نانی اور دادا دادی کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ لیکن پھر بھی

اس روز وہ ماما سے پوچھ بیٹھی تھی۔ ان کے ماما باپ کے بارے میں ماما کے چہرے پر ایک تاریک سایہ گزر گیا تھا اس کی بات سن کر پاپا نے ایک نظر ماما پر ڈال کر اسے بڑی رسائیت سے جواب دیا تھا۔

”فری! تمہاری ماما کے مئی پاپا پاکستان میں رہتے ہیں۔“ وہ ان کے جواب پر مزید حیران ہوئی تھی۔

”وہ ہم سے کبھی ملنے کیوں نہیں آئے۔ کیا پاکستان بہت دور ہے؟“

”ہاں پاکستان بہت دور ہے وہ اتنی دور آ نہیں سکتے۔ کبھی چھٹیوں میں موقع ملا تو ہم لوگ چلیں گے ان سے ملنے۔“ پاپا نے اس کے سوال کا بڑی سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

ماما ایک دم وہاں سے اٹھ گئی تھیں۔ ”اوون میں چکن رکھ کر آئی تھی میں۔ باتوں میں یاد ہی نہیں رہا۔“ وہ ان دونوں سے کہتی لیکن کی طرف بھاگی تھیں۔

پاپا نے ایک نظر نہیں جاتے دیکھا اور پھر دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ جو اس وقت ان کے اسکول کے دنوں کی تصویریں دیکھنے میں مگن تھی۔ چھٹی کا دن تھا اور فراغت سے بیٹھے پاپا کے پاس وہ ان

کے بچپن کی تصویریں لے آئی تھی۔ پاپا سے پاس بٹھا کر مختلف تصاویر سے وابستہ بہت سی بچپن کی یادیں
 مانے لگے تھے۔ ان کی باتوں اور تصویروں کو انجوائے کرتے کرتے ہی وہ دل میں آئی ایک بات بے
 دھرمک ماما سے پوچھ بیٹھی تھی۔ آخر ماما کا بھی تو کوئی بچپن ہوگا۔

ان کے ماں باپ ان کے بچپن کے دوست اسکول کالج اور پھر یونیورسٹی کی یادیں۔ تو پھر ان سے
 وابستہ کوئی چیز نظر کیوں نہیں آتی۔ ماما کا پاکستان آخر کتنا دور ہے۔ چونکہ وہ لوگ کبھی وہاں گئے نہ وہاں
 سے کوئی یہاں آیا۔

”تو ماما آپ اپنے پاپا کو ناراض کر کے خود اپنے آپ سے ہی ناراض ہو گئی تھیں۔ نانا ابا آپ سے کیا خفا
 ہوئے آپ خود سے ہی خفا ہو گئیں۔“ وہ خاموش لیٹی ماما کا تجزیہ کر رہی تھی۔

”آپ کی زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں تھی لیکن آپ پھر بھی خوش نہیں تھیں۔“ اس کی آنکھوں سے
 آنسو گر رہے تھے۔ اور یہ آنسو اپنی ماما کے لیے تھے پاپا کے لیے نانی امی کے لیے تھے۔ نانا ابا کے لیے
 تھے اور شاید خود اپنے لیے بھی تھے۔

”فری بیٹا! یہ تمہارے نانا ہیں؟“ اس کی آنکھوں کے سامنے ماضی کا ایک اور لمحہ گھوما تھا۔

خدیدہ آنٹی اس کے بیڈ کے پاس کھڑی ہوئی ایک بہت ہی رعب دار سی شخصیت کے مالک آدمی کا
 تعارف کروا رہی تھیں۔ وہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ تھی۔ ماما پاپا کی لاشیں دیکھ کر اس پر دہشت اور خوف طاری
 ہو گیا تھا۔

وہ سوتے میں چیخ مار کر اٹھ بیٹھی تھی۔ ماما پاپا کو زور زور سے آوازیں دے کر واپس بلانے کی کوشش
 کیا کرتی تھی۔ شاید وہ ان کے انتقال کا آٹھواں دن تھا جب ہاسپٹل میں خدیجہ آنٹی کے ساتھ اس نے
 انہیں پہلی بار دیکھا تھا۔

وہ پاکستان جو بہت دور تھا وہاں سے اس کے نانا آ ہی گئے تھے۔ مگر کب جب ماما ہی نہیں رہی تھیں۔
 وہ ان سے نہ لپٹی تھی نہ ماما پاپا کو یاد کر کے ان کے سامنے آنسو بہائے تھے بلکہ اجنبی نگاہوں سے انہیں
 دیکھے جا رہی تھی۔ خود انہوں نے بڑے بے تاثر سے انداز میں اس کے پاس آ کر سر پر ہاتھ پھیرا تھا اور
 پھر اس سے مزید کوئی بات کیے بغیر خدیجہ آنٹی سے اسے اپنے ساتھ لے جانے کے بارے میں بات
 کرنے لگے تھے۔

”ہاں ضوفشاں نے آخری بات مجھ سے فری ہی کے بارے میں کی تھی۔ وہ اس وقت آخری سانسیں

لے رہی تھی جب میں ہاسپٹل پہنچی۔ اس نے یہی کہا تھا کہ فری کو اس کے پاپا کے پاس کراپین بھیج دیا جائے۔ باقی یہاں کے گھر اور فری کے پاپا کے چھوڑے ہوئے تمام بیٹک بیلنس وغیرہ کا آپ دیکھ لیں۔ کیا کرنا ہے۔ یقیناً وہ سب فری کی ملکیت ہے۔“

وہ غائب دماغی کے عالم میں بیٹھی تھی۔ خدیجہ آنٹی نے اس کے جانے کی ساری تیاری کر دینی تھی۔ جب اسے یہ پتا چلا کہ وہ اپنے گھر سے کہیں انجان جگہ لے جائی جا رہی ہے تو وہ چیخ چیخ کر روئی تھی۔ خدیجہ آنٹی نے بڑی دقتوں سے اسے سمجھایا اور سنبھالا تھا۔

نانا ابان کے گھر نہیں رکے تھے۔ وہ شاید کہیں ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک بار بھی بیٹی کے گھر کے اندر قدم نہیں رکھا تھا۔ ایئر پورٹ پر وہ خدیجہ آنٹی کے گلے لگ کر خوب جھل جھل کر روئی تھی۔ وہ خاموشی سے کھڑے اسے روٹا ہوا دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اسے چپ کرانے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔ سفر میں بھی ان کا یہی انداز رہا تھا۔ وہ بالکل خاموش تھے۔ ان کی سرخ آنکھوں میں سرد مہری اور اجنبیت واضح نظر آ رہی تھی۔ تب پہلی مرتبہ اسے ان سے خوف آیا تھا۔

وہ اس سے کوئی بات نہیں کر رہے تھے لیکن سارا راستہ اس کا خیال بھی رکھتے رہے تھے۔ اس نے کھانے کو ہاتھ نہیں لگایا تو انہوں نے اس کے لیے اپیل جوس منگوایا اس کی سیٹ کو پیچھے کی طرف کر کے اس کی کمر کے پیچھے دو تین تکیے لگا دیے اور اسے کبل اوڑھا دیا تاکہ وہ پرسکون ہو کر سو جائے اور ان کے ایسا کرنے پر وہ سو بھی گئی تھی۔

پھر اس کی آنکھ اس وقت کھلی تھی جب جہاز بہت زور زور سے اوپر نیچے ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ ڈر رہی تھی۔ ابھی چند دن پہلے اس نے موت کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔



اسے ایسا لگ رہا تھا کہ ان کا پلین کریش ہونے والا ہے۔ وہ بظاہر اس سے لا تعلق سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے کہیں کھوئے ہوئے تھے۔ لیکن اس کے خوفزدہ ہونے کو انہوں نے فوراً محسوس کر لیا۔

”ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ کبھی کبھی موسم کی وجہ سے ایسا ہو جاتا ہے۔“ انہوں نے اس کے ہاتھ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھ کر اسی اجنبی سے انداز میں تسلی دی۔ وہی خشک اور روڈ سالیج۔ اسے تسلی دے کر انہوں نے اپنا ہاتھ واپس ہٹانا چاہا تو اس نے انہیں ہاتھ ہٹانے نہیں دیا تھا۔ بلکہ اپنے دونوں ہاتھوں میں ان کے ہاتھ کو جکڑ لیا تھا۔ دل بہت تیز تیز دھڑک رہا تھا اس لمحے۔

”دیپ چاہے دیکھتے رہے۔ تب استہ ان کا ہر انداز عجیب لگا تھا۔ یہاں آ کر ابتدائی چند دنوں میں ہی اس کے دل میں یہ بات راسخ ہو گئی تھی کہ نانا ابا اس سے نفرت کرتے ہیں اور آج اس نے کتنی مختلف باتیں سنی تھیں۔ ایک باپ بیٹی کے مرنے کی اطلاع پا کر نواسی کو لینے دوسرے ملک گیا تھا۔ اس بیٹی کی بیٹی کو جس نے اس کا من توڑا تھا، جس نے باپ کو بہت مایوس کیا تھا۔ جس نے باپ کی تربیت کو شرمندہ کیا تھا۔ جس نے اپنی خوشی سے ماں باپ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ وہ بیٹی باپ کو منائے بغیر منوں مٹی تلے جا سوئی تھی۔“

”کاش ماما آپ نے وہاں بیٹھ کر رونے اور بچھڑتاوے کے بجائے کراچی آ کر نانا ابا سے معافی مانگ لی ہوتی۔ میں آپ کی جگہ ہوتی تو یہی کرتی۔ ان کے پاؤں پکڑ لیتی اور کہتی ”جب تک آپ مجھے معاف نہیں کریں گے“ مجھ پر ہر خوشی اور ہر سکھ حرام ہے۔“ آپ نے پاپا کے ساتھ بھی انصاف نہیں کیا حالانکہ وہ آپ کے ساتھ مخلص تھے۔ آپ سے بہت پیار کرتے تھے آپ نے نانا ابا کے ساتھ بھی انصاف نہیں کیا اور آپ نے خود اپنے ساتھ بھی انصاف نہیں کیا۔ زندگی کے اتنے سال بچھڑتاووں کی آگ میں جلتے گزار دیے۔ خود کو سزا دیتی رہیں۔ مرتے وقت بھی نانا ابا کو دیکھنے اور معافی مانگنے کی حسرت دل میں لیے اس دنیا سے رخصت ہوئیں۔ کیوں خود کو یہ اذیت دی آپ نے ماما؟ لیکن پیاری ماما! آپ کو بہت سی باتوں کے لیے غلط سمجھنے کے باوجود میں آپ سے بہت پیار کرتی ہوں۔ بہت زیادہ آج بھی۔ مجھے پتا ہے میری ماما بہت اچھی تھیں۔ تب ہی تو اپنی ایک غلطی پر خود اپنے آپ کو یہی کبھی معاف نہ کر سکیں۔“ وہ روتے ہوئے ماما کی تصویر سے باتیں کر رہی تھی۔



اس نے اپنا بیڈروم بدل لیا تھا۔ یہ کمرہ اس کی ماما کا کمرہ تھا۔ نانی امی اسے بیڈروم چھینج کر تادیکھ کر حیران ہوئیں۔

”نانی امی! وہ ماما کا بیڈروم ہے نا۔ مجھے وہاں رہنا اچھا لگے گا۔“ اس نے سنجیدگی سے ان سے کہا۔ نانا ابا کو اس نے اس کمرے میں آتے کبھی نہیں دیکھا تھا، نانی امی البتہ ہفتہ دس دن میں ایک مرتبہ ملازم کے ساتھ خود آ کر اس کمرے کی صفائی کروایا کرتی تھیں۔ انہوں نے اسے بتایا تھا کہ اس کمرے کی کوئی چیز انہوں نے تہہ میل نہیں کی۔ یہ بیڈرے رامننگ ٹیبل، یہ وارڈروپ، یہ پردے، یہ قالین، یہ ڈیکوریشن پیسز، یہ دیوار پر لگی پینٹنگز، یہ وال کلاک، یہ لمپ، یہ بیک شیلف اور اس میں لگی بے شمار کتابیں سب بالکل وہی ہیں

وہی ہی ہیں اپنی اسی جگہ پر ہیں جہاں اس کی ماما نے انہیں ترتیب دیا تھا۔

پہلی رات جب وہ اس بستر پر سونے لگی تو آنکھوں سے خود بخود ہی آنسو گرنے لگے۔ اگلے روز اس نے وارڈ روم سے ماما کے تمام کپڑے اور دیگر تمام سامان نکال کر اس میں اپنے کپڑے وغیرہ رکھے تھے۔ اس کے علاوہ سارا سامان اس نے ویسا ہی رہتے دیا تھا۔ بک شیلف میں رکھی کتابیں جو ماما کے باذوق اور مطالعے کے شوقین ہونے کی گواہی دے رہی تھیں وہ بھی رائٹنگ ٹیبل پر رکھی سب چیزیں بھی۔ ان کے نوٹس، لیکچرز، اسائنمنٹس سب اس نے ویسے ہی رہنے دیے تھے۔ وارڈ روم میں جو ماما نے اپنے بچپن کے کھلونے سنبھال کر رکھے ہوئے تھے اس نے انہیں بھی وہیں رہنے دیا تھا۔ ان کی ڈائریاں اور نانا ابا کے دیے ہوئے کارڈز بھی وہیں رہنے دیے۔ ان کی ساگڑا ہوں پر نانا ابا کے خوبصورت ہینڈ رائٹنگ میں لکھے کارڈز۔ جن کا ہر ہر لفظ شدید محبت کا اظہار کر رہا تھا۔ دیوار پر لگی ماما کی اخباری تصویر بھی اس نے نہیں ہٹائی تھی۔ ہاں اپنے بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر ایک تصویر کا اضافہ کر لیا تھا۔ اپنے پاپا کی تصویر کا۔ صبح وہ کمرے سے نکل رہی تھی جب نانا ابا بیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ رہے تھے۔ انہوں نے اس کمرے سے نکلنے سے بڑے غور سے دیکھا۔ شاید انہیں اس کے کمرہ بدلنے کا بھی تک معلوم نہیں ہوا تھا۔ اس کے سلام کا انہوں نے سنجیدگی سے جواب دیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ وہ نیچے آئی تو نانی امی ان ہی کے لیے ناشتہ تیار کر رہی تھیں۔ وہ ناشتہ اپنے کمرے میں کرتے تھے۔ وہ ٹرے تیار کر چکیں تو وہ جلدی سے بولی۔

”میں لے جاؤں ناشتہ؟“ ان کے جواب دینے سے پہلے ہی وہ ٹرے اٹھا کر کچن سے نکل گئی۔

دروازے پر دستک دے کر اس نے اجازت کا اظہار کیا۔ اجازت ملنے پر جب وہ اندر داخل ہوئی تو وہ صوفے پر بیٹھے اخبار پڑھتے نظر آئے۔ غیر متوقع طور پر اسے دیکھ کر ان کے چہرے پر جو بھی تاثرات ابھرے وہ انہیں نظر انداز کرتی ٹیبل پر ٹرے رکھنے لگی۔ ان کی طرف اس نے بالکل بھی نہیں دیکھا پتا تھا انہیں دیکھ لیا تو ہمیشہ کی طرح ڈر جائے گی۔ ٹرے رکھتے ہی فوراً باہر آ گئی۔ باہر نکل کر اس نے سکون کا سانس لیا۔ اجنبیت کی یہ دیوار جو انہوں نے اس کے اور اپنے بیچ حائل کی ہوئی ہے وہ اسے گرا کر ہی دم لے گی۔ اس عزم اور اس بچتہ ارادے کے باوجود ہر بار ان کا سامنا ہونے پر وہ اپنے ہاتھ پاؤں کانپتے اور سرد ہوتے محسوس کرتی تھی۔ روزانہ اس طرح ڈرتے اور کانپتے وہ ان کے لیے ناشتہ لے جانے لگی تھی۔ پہلے ان کا کوئی فون آتا یا کوئی مہمان تو وہ خود آ کر میسج دینے کے بجائے کسی ملازم کے ہاتھ کھلوایا

کر رہی تھی لیکن اب وہ یہ کام خود کرنے لگی تھی۔ یہاں تک کہ بعض اوقات جب ان کے کسی دوست کی آمد پر مانی اس کی جگہ وہ خود چائے وغیرہ بنا کر ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ وہ یقیناً اس کی ان بے تکلفانہ باتوں کو پسند نہیں کر رہے تھے۔ لیکن اب تک انہوں نے اس سے کچھ کہا نہیں تھا۔



”تمہاری لمیٹ کی تیاری کیسی ہو رہی ہے؟“ کچن ٹیبل پر چڑھ کر بیٹھے ہوئے سعد کو اس نے مخاطب کیا۔

”ہمیں تیاری کی کیا ضرورت ہے۔ جیمس لوگ ایسے چھوٹے موٹے ٹینوں کے لیے بلکان نہیں ہوا کرتے۔“ اس نے فرضی کالجھانزے تھے۔ وہ فریج کھول کر کھڑی ہوئی تھی اس کی میاں منٹھوالی بات پر بے اختیار گردن گھما کر بولی۔

”غور کا انجام اکثر بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ تم نے وہ خرگوش اور کچھوے والی کہانی تو سنی ہی ہوگی۔“

”محترمہ! یہ غور نہیں بلکہ اپنی صلاحیتوں سے آگاہی ہے۔ مئی بھی تمہاری طرح بلاوجہ مجھے ہولارہی تھیں کہ یوں صحیح تیاری نہیں ہوگی۔ کسی انٹرنیٹ ٹیوٹ میں داخلہ لے لو۔ میں نے کہا بے فکر رہیں آئی بی اے کا Aptitude Test بہت شاندار طریقے سے آپ کو پاس کر کے دکھاؤں گا۔ بس آپ مجھے بوکھلائیں مت۔“

فریج سے فریج کریم نکالی اور ایک پلیٹ میں اسٹرابریز رکھیں۔ سعد کے لیے یہ دونوں چیزیں نکالنے کے دوران وہ اس کی باتیں خاموشی سے سنتی رہی۔ اس نے سعد کو پلیٹ پکڑائی تو وہ ”جزاک اللہ“ جیتی رہو“ اور ”خوش رہو“ کہتا اسٹرابریز اور کریم سے لطف اندوز ہونے لگا تھا۔ یہ سعد کا پسندیدہ ریڈی میڈ میٹھا تھا۔

وہ اس وقت کچن میں رات کے کھانے کے لیے سلاہ بنانے میں مصروف تھی۔ نانا ابا کو اس نے ہمیشہ کھانے کی میز پر سلاہ بڑے اہتمام اور شوق سے کھاتے دیکھا اور ان کی یہی پسند اس وقت اسے کچن میں لے آئی تھی۔ کل نی وی پر ایک کوئنگ سے متعلق پروگرام آ رہا تھا اور اس میں اس نے یہ ترکیب دیکھی تھی۔ ترکیب کیونکہ بالکل سادہ اور آسان تھی اس لیے وہ فوراً اسے تیار کرنے کا پروگرام بنا بیٹھی تھی۔

”یا رخواخواہ لوگ آئی بی اے کے ٹیسٹ کو ہوا سمجھتے ہیں۔ اگر آپ کی جزل نالج اچھی ہے۔ متھس اور انٹس میں آپ اتھنہ ہیں پلس یہ کہ آپ کسی بھی پوچھی گئی بات کو فوراً سمجھ کر نہایت تیز رفتاری سے بغیر

گھبرائے اس کا جواب دے سکتے ہیں تو گھبرانے اور نروس ہونے کی بات ہی کیا ہے۔ اباں اصل امتحان ہی بندے کے اعصاب کا ہوتا ہے کہ کون کتنا انڈر پریشر آ جائے گا اور کون لوگ ہیں جو کسی دباؤ میں نہیں آئیں گے۔“ اسٹرا میری منہ میں ڈالتے ہوئے اس نے فریاً کو تفصیلی جواب دیا پھر کچھ دھیان آنے پر اس نے موضوع بدلا۔

”ویسے یہ آج کچن کو رونق کس خوشی میں بخشتی گئی ہے۔“ اس نے چولہے پر آلو ابلنے کے لیے رکھے ہوئے تھے اس وقت چھری سے یہی چیک کر رہی تھی کہ ہو چکے ہیں یا ابھی کسر ہے۔

”میں نے سوچا کچھ پکایا جائے۔ فارغ ہو رہی ہو، ہورہی تھی۔ نانا ابا کے لیے سلا رینار ہی ہوں۔ بڑی اچھی ترکیب ہے۔ میں نے کل ہی سیکھی ہے۔“

وہ چولہا بند کرتے ہوئے اس کی طرف گھومی۔ وہ اس کی بات سن کر ہنس پڑا۔

”قرب قیامت کے آثار ہیں اب فریاً عبدالرحمان سوچنے بھی لگی ہیں۔ ویسے نانا ابا سے مجھے ابھی سے ہمدردی ہو رہی ہے۔“ وہ اس کے مذاق اڑانے پر چڑ گئی۔

اس کا پھولا ہوا منہ دیکھ کر وہ تہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ اسی وقت نانی امی بچن میں داخل ہوئی تھیں۔ انہیں آتا دیکھ کر وہ جلدی سے میز پر سے اتر گیا تھا اور بڑی شرافت سے سیدھے کھڑے ہو کر انہیں سلام کیا۔

”وعلیکم السلام۔“ وہ اسے دیکھ کر پیارے سے بولیں۔

”کل میں نے پائے پکائے تھے۔ تب سے ہی مجھے تم بہت یاد آ رہے تھے۔ میں یہی سوچ رہی تھی کہ سعد کی پسند کی ڈش بنی ہے۔ آجاتا تو کھا لیتا۔“ وہ ان کی بات سن کر نوراً بولا۔

”کوئی بات نہیں آپ مجھے اب پائے کھلا دیں۔ مجھے واپسی کی کوئی جلدی نہیں ہے۔“ وہ اس کی بے تکلفی پر مسکراتی ہوئی فریح کی طرف بڑھیں۔

”فری کو تو پائے زیادہ پسند نہیں۔ تھوڑا سا چکھا تھا اس نے۔ کہتی ہے ہاتھ چپکتے ہیں مجھے الجھن ہوتی ہے۔“ وہ فریح سے پائے نکالتے ہوئے بولیں۔

”اس موقع پر اردوز بان میں ایک محاورہ بولا جاتا ہے۔ محاورہ مجھے کچھ صحیح سے یاد نہیں آ رہا۔ ویسے اس میں کچھ بندرادرارک کا ذکر ہوتا ہے۔“ وہ فریاً کی طرف شرارت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہوا نانی امی سے بولا۔ اس سے پہلے کہ کوئی جوابی کارروائی ہوتی وہ ان سے بولا۔

”آپ پائے گرم کریں میں تندوری نان لے کر آتا ہوں۔ گھر کی روٹی کے ساتھ مزہ نہیں آئے گا۔“

ان کے سر ہلانے پر اچکن سے نکل گیا تھا۔

پھر سعد تو پائے کھانے کے بعد کچھ ہی دیر رکھا۔ اس کے جانے کے بعد وہ دوبارہ سے اپنی نامکمل سلاہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ یوپی اہتیا ط اور محنت سے اس نے اسے تیار کیا تھا۔ کھانے کی میز پر حسب معمول نانا بابا نے باقی تمام ڈشز پر سلاہ کو ترجیح دی۔ وہ انہیں اپنی بنائی ہوئی سلاہ کھاتا دیکھ کر دل ہی دل میں بہت خوش ہو رہی تھی۔

’کیسی لگی آپ کو سلاہ۔ قمری نے بنائی ہے۔‘ وہ تو خاموش ہی رہتی لیکن نانی امی نے انہیں یہ بات بتادی۔ ان کے ہاتھ میں موجود فوک منہ کی طرف جاتے رک گیا۔ انہوں نے ایک نظر بڑے غور سے اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھا۔ اسے ڈر لگا کہ شاید ابھی وہ کاٹنا واپس پلیٹ میں رکھ کر پلیٹ بھی خود سے دور ہٹادیں گے۔ لیکن انہوں نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔

’مزرے کی ہے۔‘ ان کا جواب مختصر تھا اور اس مختصر جواب کے بعد وہ دوبارہ اس سلاہ کو کھانے لگے تھے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ان کے تاثرات اور انداز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس کے دل میں جو ڈرتا وہ یکدم دور ہو گیا۔ اسے لگ رہا تھا وہ اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی کوئی چیز بھی کھانا پسند نہیں کریں گے۔

فریاد کی کالچ لائف شروع ہو چکی تھی۔ حالانکہ نانی امی نے اس سے ایسا کچھ نہیں کہا تھا لیکن اس نے خود ہی نرافہ زرز اور نانی شرنس کی جگہ شلوار قمیص اور دوپٹہ پہننا شروع کر دیا تھا۔ پہلے وہ کہیں آنے جانے میں تو شلوار قمیص پہن بھی لیا کرتی تھی لیکن گھر میں کبھی نہیں پہنتی تھی۔ اب ان کے کپے بغیر اس نے خود ہی اپنے لباس میں یہ تبدیلی پیدا کی تو انہیں بہت خوشی ہوئی تھی۔ اب اگر وہ دیکھنے والوں کو اپنے نقوش سے اٹالین یا اسپینش دکھائی دیتی تو لباس اور بول چال سے سو فیصد پاکستانی اور مشرقی لڑکی نظر آتی۔ سعد نے پہلی مرتبہ اسے شلوار قمیص میں دیکھا تو بے ساختہ بولا تھا۔

’اوہو باری پاکستانی ڈریس میں۔‘ وہ اب بچپن کی طرح اس نام پر چڑ انہیں کرتی تھی۔ بہت قریبی دوستوں کو اتنا حق تو ہوتا ہی ہے کہ وہ آپ کو جس نام سے چاہے پکاریں۔ وہ کبھی اسے فری کہتا، کبھی فری، کبھی باری۔ بہت سے تک نمر تھے جن سے وہ اسے پکارا کرتا تھا۔ فری تو وہ صرف اس وقت کہی جاتی تھی جب وہ اس سے ناراض ہوتا یا اس کی کسی بات پر اسے غصہ آیا ہوا ہوتا۔ اب روزانہ ساتھ بیٹھ کر پڑھنا تو نہیں جو پاتا تھا لیکن وہ ایک دوسرے سے روز ملتے اور اگر مل نہ پائیں تو فون پر بات تو ہو ہی جایا کرتی

تھی۔ آئی بی اسے جا کر بھی اس کی شرارتوں اور لاابالی پن میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ آج بھی اتنی ہی شوخ اور زندہ دل تھا جتنا بچپن میں ہو کر تھا۔ اس کے دوست بنانے کی رفتار بھی وہی تھی۔ کبھی کبھی اس کے دوستوں کی طویل قبرست سے فریا کو بلا وجہ چڑھنے لگتی۔



وہ بہت گہری نیند سوز ہی تھی۔ جب اسے ایسا لگا جیسے کوئی اسے آواز دے رہا ہے۔ کچھ سوئی جاگتی کیفیت میں اس نے آنکھیں ذرا سی کھولیں تو نانی امی کو خود پر جھکا ہوا پایا۔

”اٹھو فری! تمہارے نانا ابا کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ میں انہیں ہاسپٹل لے جا رہی ہوں۔“ ان کی یہ بات اسے حواس باختہ کرنے کے لیے کافی تھی۔ نانی امی بہت پریشان نظر آ رہی تھیں۔ ان کے پیچھے نانا ابا کے کمرے میں آتے ہوئے اس کا دل انجانے وسوسوں میں مبتلا ہوتا، اندر ہی اندر ڈوب رہا تھا۔ ذرا نیور اور اسلام کی مدد سے انہیں گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹاتے ہوئے وہ اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”پریشان مت ہونا تمہیں میں نے اس لیے اٹھا دیا کہ کہیں ہمارے جانے کے بعد تمہاری آنکھ کھل جاتی تو تم ہم سب کو غیر موجود پا کر پریشان ہو تیں۔“ اسے تسلی دیتی وہ گاڑی میں بیٹھ گئی تھیں۔

”میں بھی چلوں گی نانی امی۔“ وہ ذرا نیور کو کہاں چلنا ہے یہ بتا کر گاڑی اشارٹ کرنے کا کبرہ رہی تھیں جب وہ بول اٹھی۔

”تم گھر پر دعا کرو بیٹا! گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔“ انہوں نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اسے تسلی دی تھی اور پھر فوراً ہی گاڑی اشارٹ ہو گئی۔ اس نے تو یہ بھی نہیں دیکھا تھا کہ وہ ہوش میں ہیں یا نہیں۔ اس لمحہ اسے پتا چلا کہ وہ آج بھی وہی فریا عبد الرحمان ہے۔ وہی جو موت کو قریب سے دیکھ کر سہم گئی تھی۔ وہیں پورچ میں کھڑے کھڑے اسے لگان کے گیٹ پر ایک ایسویٹس آ کر رکی اور پھر اس میں سے اسے آگے سوچنے سے پہلے اس نے اپنی آنکھیں کس کر بند کر لی تھیں۔

”انہیں کچھ بھی نہ ہو اللہ میاں۔ میرے نانا ابا کو بچا لیجئے۔ میری زندگی بھی انہیں دے دیجئے۔ میری زندگی کا ایک ایک پل اور ایک ایک لمحہ انہیں مل جائے۔ مجھ سے سب کچھ لے لیجئے لیکن انہیں زندگی دے دیں۔“

وہ رات کے اس آخری پہر پورچ میں کھڑی بے آواز دعائیں مانگ رہی تھی۔ پتا نہیں ایسا انکشاف ہو رہا تھا اس پر اس لمحہ۔ اسے بس یہ پتا چل رہا تھا کہ وہ نانا ابا سے بہت محبت کرتی ہے۔ اپنی زندگی سے

کہ وہ اچانک پورچا سے بھاگتی ہوئی اندر لاؤنج میں آئی تھی اور بغیر کچھ سوچے سمجھے سعد کا موبائل لہرایا تھا۔ بیٹے بیلوں کے بعد اس کی نیند میں ڈوبی آواز سنا کی دی۔
 "سعد! نانا ابا کو پتا نہیں کیا ہوا ہے۔ ان کی طبیعت بہت خراب ہے۔ تم جلدی سے آؤ۔" وہ روتے
 روتے نورا بولی۔

"تم روؤ مت فری! میں آ رہا ہوں۔"

اس منٹ بعد سعد اور آئی ان کے گھر میں تھے۔ آئی اسے تسلی دیتے ہوئے سمجھانے کی کوشش کر رہی
 تھی کہ صبح ہونے پر وہ اسے ہاسپٹل لے جائیں گے لیکن اس کی جیسے ایک ہی ضد تھی۔ مجھے ہاسپٹل جانا
 ہے۔ مسلسل روتی اور ہلکتی وہ ان سے سنبھالی نہیں جا رہی تھی۔

"اسے لے چلتے ہیں مٹی۔" وہ ہار ماننے والے انداز میں بے بسی سے بولا۔ کچھ دیر بعد وہ ان دونوں
 کے ساتھ ہاسپٹل جا رہی تھی۔ انہیں فوری طور پر ٹریٹمنٹ دیا جا رہا تھا۔ بہت شدید دل کا دورہ تھا۔ نانی
 کی خاموشی سے آنسو بہاتی تسلی کے دانے گرائے جا رہی تھیں۔ آئی ان کے پاس بیٹھ کر انہیں تسلی دینے
 لگی۔ وہ سعد کے ساتھ بیٹھی اب بالکل خاموش تھی۔ یہاں تک کہ رو بھی نہیں رہی تھی۔ ہاں اس کا روال
 وہ ان کے لیے دعا گو ضرور تھا۔ آج سے پہلے اسے خود معلوم نہیں تھا کہ وہ نانا ابا سے اتنی والہانہ محبت
 کرتی ہے اور آج جب اسے یہ بات معلوم ہوئی تھی وہ اسے ڈرا رہے تھے۔ جدائیوں کے اندیشے میں
 ڈکا کر رہے تھے۔

"آپ سے محبت میرے خون میں شامل ہے۔ میں نے ماں سے جینز (Genes) میں آپ کی محبت
 لے لی ہے۔ جس وقت میں پیدا ہوئی میری ماں نے بڑی شدت سے آپ کو پکارا تھا۔ میرے کانوں نے دنیا
 میں آتے ہی جو پہلا لفظ سنا وہ 'پاپا' تھا۔ ایک بیٹی نے بڑی شدت سے باپ کو یاد کیا تھا اس لمحہ جب خود
 اس نے ایک بیٹی کو جنم دیا تھا۔ آپ کے ساتھ میرا روح کا رشتہ ہے۔ صرف خون کی رشتہ نہیں ہے ہمارا اور یہ
 اتنی آسانی سے آپ کیسے توڑ کر جا سکتے ہیں۔ میں آپ کو یہ رشتہ توڑنے نہیں دوں گی۔ ابھی تو مجھے یہ
 پتا آپ کو بتانی ہے کہ میں فریاء عبدالرحمان ساری دنیا میں سب سے زیادہ آپ سے پیار کرتی ہوں۔
 کیا آپ میری جان مانگیں میں وہ بھی دے دوں گی۔"



نانا ابا کی حالت اب خطرے سے باہر تھی۔ بڑا رحم کیا تھا اللہ نے ان پر۔ ورنہ ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ ایک

بہت شدید تھا۔ ان کی عیادت کے لیے آتے والوں کا ہاتھ بندھ گیا تھا۔ نانی امی اسے زیادہ وقت ہاسپٹل میں نہیں رہتے دیتی تھیں۔ وہ تھوڑی سی دیر کے لیے ڈرائیور یا سجد کے ساتھ آتی اور پھر نانی اسے ان ہی کے ساتھ گھر بھجوا دیا کرتیں۔ جس دیر وہ وہاں راتی تب بھی نانا ابابا کو سلام کر کے سامنے پڑھنے پر بیٹھ کر خاموشی سے انہیں دیکھتی رہتی۔ وہ اس کے سلام کا جواب دے کر اس کی خیریت پوچھتا۔ وہ جواب میں ’ٹھیک ہوں‘ کہہ دیتی اور پھر وہ اپنی عیادت کے لیے آئے دیگر اشخاص کی طرف متوجہ ہو جاتے۔

اس روز بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ شام میں انہیں دیکھنے آئی تھی۔ نانا ابابا کی کوئی رشتے بھانجی اپنے بیٹے کے ساتھ آئی بیٹھی تھیں۔ وہ حسب معمول سلام کرتی خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ کتنا دل چاہتا تھا اس کا وہ انہیں بتائے کہ ”آپ کی بیماری نے مجھے بہت پریشان کر دیا ہے۔ میں اب تک شاک کی کیفیت میں ہوں اور کیا آپ کو پتا ہے میں نے آپ کے لیے کتنی ساری دعائیں مانگی ہیں نانی امی کہتی ہیں صدقہ اور خیرات سب بلاؤں کو نال دیتے ہیں میں نے یہی بات سوچ کر اپنے پاس سارے پیسے خرچ کر دیے۔“

لیکن وہ یہ سب سوچ سکتی تھی۔ ان سے سلام سے اگلی بات کرنے کی اس کی جرات ہی نہیں ہوتی۔ اس سے تو اور لوگوں کی طرح رسمی انداز میں ان کی خیریت تک نہیں پوچھی جاتی تھی۔ شاید دل میں کہیں خوف بیٹھا تھا کہ اگر انہوں نے میری باتوں کا اچھی طرح جواب نہ دیا تو میں ہرٹ ہوں گی۔ آج بھی روز ہی کی طرح ہو رہا تھا۔ وہ خاتون تھیں بھی بہت باتونی۔ نانا ابابا ان کی اکثر باتوں کے جواب میں ہوں ہاں سے کام چلا رہے تھے۔ اسے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ نانا ابابا سے بڑے غور سے دیکھ رہے ہیں۔ خدا خذ کر کے انہوں نے جانے کا نام لیا تو اس کے ساتھ یقیناً نانا ابابا نے بھی سکون کا سانس لیا ہوگا۔

”یہاں آؤ فری۔“ ان کے نکلنے ہی نانا ابابا نے اسے اپنے پاس بلایا تھا۔ اس نے بڑی بے ساختگی میرا ہٹھا کر انہیں دیکھا تھا۔

”فری“ کتنا پیارا لگا تھا اپنا پیار کا یہ نام ان کے منہ سے۔ وہ تو اسے فریا کہا کرتے تھے۔ پھر آج یہ بدلا ہوا طرز متخاطب.... وہ حیرت زدہ سی کچھ ہچکچاتے ہوئے ان کے پاس آ گئی۔ نانی امی بیڈ کے پاس رکھ کر سی پر بیٹھی تھیں۔ وہ ان کے پاس آ کر کھڑی ہوئی تو نانا ابابا نے بیڈ پر زرا سا کھٹکے ہوئے اس کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی۔

”یہاں بیٹھو۔“ وہ حیران پریشان ان کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ لیٹے ہوئے بڑے غور سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”تم نے کپڑے کیوں نہیں بدلے۔“ انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا۔ ”کل بھی یہی کپڑے پہنے ہوئے تھے اور شاید برسوں بھی۔ اور مجھے تو بال بھی ایسا لگ رہا تھا برش نہیں کیے گئے۔“

وہ بلاوجہ کی خوش فہمی میں ہنستا ہوا رہی تھی۔ یہاں ان کے کتنے ملنے والے آتے ہیں اور ایسے میں ان کی نواہی کا یہ مزا ہوا حلیہ انہیں اپنے ملنے والوں کے سامنے ضرور شرمندہ کرواتا ہوگا۔ ان کی یہ بات بہت بری طرح اس کے دل پر جا کر لگی تھی۔ اتنے دنوں بعد وہ اس سے بات بھی کر رہے ہیں تو کیا۔ ”آپ کو محبت نظر کیوں نہیں آتی۔“ وہ سر جھکا کر اپنے آنسو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”میں اب بالکل ٹھیک ہوں بیٹا! تم بلاوجہ خود کو پریشان مت کرو۔ ڈاکٹرز کہہ رہے ہیں دو تین دن میں میں ڈسچارج بھی ہو جاؤں گا۔ اب کل جب مجھ سے ملنے آؤ تو اچھی طرح ڈریس اپ ہو کر ہنستی مسکراتی ہوئی آنا۔ یہ روتی بسورتی فری تو مجھے بالکل بھی اچھی نہیں لگ رہی۔“

انہوں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے جس لہجے میں یہ بات کہی۔ اسے سن کر وہ بے ہوش ہو جاتی تو بھی کم تھا۔ وہ منہ پھاڑے خیر سے ان کی سمت دیکھ رہی تھی۔ اتنی محبت اور ایسی فکر مندگی۔ وہ بھی اس کے لیے۔ وہ اس کی حیرت پر مبہم سا مسکرائے۔ ایسے جیسے اس کی ہر سوچ وہ بڑے آرام سے پڑھ رہے تھے۔

”اور کھانا کھانا بھی لگتا ہے۔ آج کل بالکل چھوڑا ہوا ہے۔“ وہ مزید گویا ہوئے تھے۔ پتا نہیں ایک دم اس کو کیا ہوا تھا۔ ان کے بازو پر سر کا کروہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں نا نا! مجھے آپ کے بغیر کچھ اچھا نہیں لگتا۔ نہ کھانا کھانا نہ تیار ہونا نہ کسی سے ملنا۔“ انہوں نے اسے خود سے مزید قریب کر لیا۔ ان کے ساتھ لگی وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ نانی امی اسے چپ کرانے اور ان کے پاس سے ہٹانے کے لیے اٹھنے لگیں تو انہوں نے سر کے اشارے سے ایسا کرنے سے روکا۔

”قری! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ دیکھو مجھے کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔“ وہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے کہنے لگے۔

چند سیکنڈ تک گمرے میں صرف اس کی سسکیاں گونجتی رہیں۔ اپنی بے اختیار کیفیت کا احساس ہوا تو

وہ ایک دم ان کی باتوں کے جھلنے سے نکل کر سیدھی ہو گئی۔ وہ اپنے ہاتھ سے اس کے آنسو صاف کر گئے تھے جبکہ وہ اب کچھ جھینپت اور شرمائی ہوئی سی پیشی تھی۔

”بالکل پکا پراس کرو میرے ساتھ کہ گھر جا کر کھانا کھاؤ گی بالکل ٹھیک طرح۔ جیسے راشن میں کھانی ہو اور بغیر روئے اور پریشان ہوئے آرام سے لیٹ کر سو جاؤ گی۔“

اس نے اسی جھینپتے.... سے انداز میں سر ہلا کر گویا وعدہ کیا۔ نانی امی حیرت اور خوشی کے لمبے لمبے تاثرات کے ساتھ نانا فریسی کی محبت کا یہ مظاہرہ دیکھ رہی تھیں۔ یہ پھانس تو انہیں ہر لمحہ چھینتی تھی کہ فریسی ان سے بدگمان رہتی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ شاید نانا اب اس سے نفرت کرتے ہیں۔ حالانکہ سچائی یہ تو نہیں تھی لیکن وہ جانتے ہوئے بھی اس کی یہ غلط فہمی دور نہیں کر پاتی تھیں اور آج جب ان کے سچ سے اجنبیت کی یہ دیوار یعنی تو نانی امی نے خود کو بڑا پرسکون اور مطمئن محسوس کیا تھا۔

گھر آ کر وہ سیدھی تہانے گھس گئی۔ نہانے کے بعد نماز پڑھی اور پھر بڑی خوشی خوشی کھانا کھانے بیٹھ گئی۔ حالانکہ وہ کھانے کی میز پر بالکل تہا تھی لیکن پھر بھی اس نے بہت اچھی طرح پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ اگلے روز جب وہ ہاسپٹل آئی تو سرخ رنگ کا کاشن کا سوٹ پہنے ہوئے تھی۔ پلین سوٹ جس کے چاکوں گھے اور آستینوں پر سرخ رنگ کی ہی خوبصورت اور نازک سی لیس لگی ہوئی تھی۔ بالوں کی اونچی سی پونی بنائے وہ بہت تروتازہ اور نکھری نکھری سی نظر آ رہی تھی۔ نانا اب اسے دیکھتے ہی بڑے بھرپور انداز میں مسکرائے۔ اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے اسے اپنے پاس بلایا۔ وہ ان کے پاس آئی تو انہوں نے اس کا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔

”ہاں ایسے تیار ہونے کو کہہ رہا تھا میں تمہیں۔ کل والی بھی سمجھی سی فریسی سے آج والی بھی سنو فریسی کہیں خوبصورت لگ رہی ہے اور یہ ریڈیکلر تو تم پر بہت ہی اچھا لگ رہا ہے۔“

انہوں نے سنجیدگی سے اس کی تعریف کی۔ وہ نانا اب اسے اپنے پاس بیٹھے تین انگل کی وجہ سے اپنی تعریف پر بہت بری طرح جھینپ گئی جبکہ وہ دونوں اس کے شرمانے پر با آواز بلند ہنس پڑے۔



نانا اب ہاسپٹل سے گھر آ گئے تو وہ نانی امی کے ساتھ مل کر بڑی سنجیدگی، لگن اور مستقل مزاجی کے ساتھ ان کی تیمارداری میں مصروف ہو گئی۔ کھانا یا جوس وغیرہ لے کر آتی تو وہ اسے اپنے پاس بٹھا لیا کرتے تھے۔ پھر کھانے کے دوران وہ اس سے مختلف موضوعات پر باتیں کرتے لگتے۔ ان سے بہت زیادہ بے تکلف

تو وہ اب بھی نہیں ہو پائی تھی۔ لیکن ان کا اس طرح باتیں کرنا اور پاس بٹھانا آہستہ آہستہ اس کی جھجک ختم کرنے میں معاون ضرورت ثابت ہو رہا تھا۔

وہ ان کی باتیں بڑے غور سے سنتی تھی۔ اسے فخر ہوتا تھا اس بات پر کہ اس کے نانا ابا قابل اور انکل کچھ نکل سم کے انسان ہیں۔ ان کے علم و ذہانت اور وسیع مطالعے کی وہ دیگر لوگوں سے جس طرح تعریفیں سنا کرتی تھی اب خود بھی ان کی معترف ہو رہی تھی۔ ان کی پیڈ رائٹنگ تو اسے اتنی خوبصورت لگتی تھی کہ وہ اکثر نقل کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس روز جب اس نے باتیں کرتے کرتے انہیں یہ بات بتائی تو وہ خوب ہنسے۔

”اچھا تو تم ”D“ اور ”H“ میرا جیسا بنانے کی کوشش کرتی ہو۔“ وہ اس کے معصومانہ سے اعتراف کو خوب انجوائے کر رہے تھے۔

”ہاں جب میں اسکول میں تھی تب سے ہی آپ کے جیسا ”D“ اور ”H“ بنانے کی کوشش کرتی ہوں۔ اب بھی آپ جیسا تو نہیں لیکن آپ سے ملتا جلتا ضرور بنا لیتی ہوں۔“ وہ پاس رکھا رائٹنگ پیڈ اٹھا کر انہیں بنا کر دکھانے لگی تھی۔

”تمہیں نقل کی کیا ضرورت ہے۔ تمہاری اپنی رائٹنگ بہت خوبصورت ہے۔ میں نے کل اسٹڈی میں تمہارے کچھ پیپرز رکھے دیکھے تھے۔ شاید تمہارا کوئی اسائنمنٹ تھا۔ بہت صاف ستھری اور پختہ لکھائی ہے تمہاری۔“ وہ رائٹنگ پیڈ کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

ان کے لہجے میں سائنس پا کر وہ بہت خوش ہوئی۔ ”آپ کو اچھی لگی تھی میری رائٹنگ۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔

”وہ میرا پاکستان اسٹڈیز کا اسائنمنٹ ہے۔ کل رات ہی میں نے مکمل کیا ہے۔ بڑی محنت کی ہے میں نے اس پر۔ آپ پڑھیں گے؟“ اس نے بڑے شوق اور امید سے پوچھا۔ انہوں نے پڑھنے کی ہامی بھری تو وہ فوراً بھاگتی ہوئی اسٹڈی سے اپنا اسائنمنٹ اٹھا کر لے آئی۔

”کل جمع کروانا ہے۔ ابھی میں نے فیئر نہیں کیا۔“ اس نے اسائنمنٹ ان کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بتایا تھا۔ انہوں نے سائیڈ ٹیبل سے اپنے گلاسز اٹھا کر لگائے اور پھر ایک نظر عنوان پڑھتے ہوئے اس کا لکھا پڑھنے لگے۔ وہ ان کے برابر بیٹھی کبھی اپنے لکھے لفظوں پر نظر دوڑانے لگتی کبھی ان کے چہرے کے تاثرات پر۔ مضمون پورا پڑھ کر انہوں نے بڑی حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھا۔

”یہ پورا تم نے خود لکھا ہے۔ کسی سے مدد لیے بغیر۔“ ان کے لہجے میں ہستجاب تھا۔ اس نے نثر یہ انداز میں گردن ہلائی۔

”بہت اچھا لکھا ہے تم نے۔ میں تیرا ان ہور ہا ہوں تمہاری اپر رتج اور تمہارے پیچڑر انداز پر۔ یہ تمہارے لیول سے بہت اونچے درجے کا مضمون ہے۔ یا لکل ایسا لگ رہا ہے جیسے کسی ایم اے کے اسنوڈنٹ کا لکھا ہوا مضمون ہے۔“ ان کی یہ تعریف اس کا سیروں خون بڑھا گئی۔ ”خلافت مودمت“ پر بہت جامع اور موثر انداز میں لکھا ہے تم نے۔“

”کالج میں میری انگلش کی ٹیچر ہیں نامیڈم سعد یہ۔ فرسٹ ایئر میں انہوں نے تہیں پڑھائی پڑھائی تھی اب سینڈ ایئر میں بھی پڑھا رہی ہیں وہ بھی یہی کہتی ہیں۔ بلکہ وہ تو مجھ سے یہ کہہ رہی تھیں کہ فریا آپ آگے ماس کیونیکیشن پڑھئے گا۔ آپ میں لکھنے کی زبردست صلاحیت ہے۔“

ان کی تعریفوں پر بے تحاشا خوش ہوتے ہوئے اس نے اپنی ٹیچر کی کبھی بات دہرائی۔ مسکراتے مسکراتے وہ ایک دم کچھ سنجیدہ ہو گئے۔ پتا نہیں کیا بات انہیں یاد آ گئی تھی۔ شاید بہت سال پہلے صوفشاں فاروق نے بھی اس سے ملتے جلتے الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے اپنے لیے جرنلزم کو منتخب کیا ہوگا۔



آخری پیریڈ فری تھا اور وہ اپنی دوستوں کے ساتھ لائبریری میں بیٹھی مختلف میگزینز دیکھ رہی تھی۔ جولیا رابرٹس کی تصاویر اور اس کے بارے میں شائع ہونے والی خبر کو غور سے پڑھنے لگی۔

”پسند ہے تمہیں جولیا رابرٹس۔“ زہرہ اس کے ساتھ ہی میگزین دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے سوال کے جواب میں فوراً بولی۔

”مجھے تو بس ٹھیک ہی لگتی ہے۔ وہ سعد ہے نا۔ اسے جولیا رابرٹس بہت پسند ہے۔ وہ تو اپنے کمپیوٹر میں ڈیسک ٹاپ پر بھی اسی کی تصویر رکھتا ہے۔“ زہرہ اس کی بات بڑی توجہ سے سن رہی تھی جبکہ مناہل کے سعد کا نام سنتے ہی منہ کے زاویے بگڑنے لگے تھے۔

”یہ غلام رسول پھر بیچ میں آ گیا؟“ زہرہ اس میں ہیر پھیر کر جس طرح وہ سعد کا ذکر لے آتی تھی اس سے سب سے زیادہ مناہل کو چڑھتی۔

”تمہارے سعد منیر صاحب کا آج سے میں نے یہی نام تجویز کیا ہے۔ کوئی بات ہو رہی ہو چاہے کسی بھی موضوع پر ہو سعد کا ذکر آنا وہاں لازمی ہے۔ میں تو بلاوجہ چڑھنے لگی ہوں اس بندے سے۔“ سعد

کے بارے میں متناہل کے اتنے فضول گفتگوں پر اس کا منہ بن گیا۔

”اتنا بھی میں اس کا ہر وقت ذکر نہیں کرتی اور ویسے بھی وہ میرا بچپن کا دوست ہے۔ تم لوگوں سے تو کالج میں آ کر دوستی ہوئی ہے۔ میرا سب سے پرانا دوست وہی ہے۔“

”ویسے یہ تمہارا بہترین دوست سعد میرے بہترین دوست ہی ہے نا۔“ نمرہ کا انداز چھیڑنے والا

”تم لوگوں کا ذہن ان خرافات سے آگے جاتا بھی ہے یا نہیں۔“ وہ اس کا مطلب سمجھ کر بگڑی۔

”بھئی ایسی کوئی ناممکن بات بھی نہیں ہے۔ یہ کیا پتا کسی دن وہ جو لیا رابرٹس کو ہٹا کر ڈیک ٹاپ پر تمہیں لے آئے۔ آفت زل امید پر دنیا قائم ہے۔“ متناہل بھی نمرہ کے ساتھ مل گئی۔

”بہت اچھی دوستی ہے ہماری ان تمام بے ہودگیوں اور خرافات سے پاک۔ تم لوگ نہیں سمجھ سکتیں اس بات کو۔“ اس نے میگزمین بند کرتے ہوئے گویا گفتگو تمام کی پھر رسٹ و اچ پر نظر ڈال کر ان لوگوں سے

”چھٹی کا نام ہو گیا ہے گھر نہیں چلنا۔“ اس کی بات سنتے ہی ان سب کو بھی وقت کا خیال آیا۔

”ڈرائیور چھٹی پر ہے۔ آج پبلک بس سے جانا ہے مجھے۔“ مین گیٹ کی طرف جاتے ہوئے اس نے

اپنا متناہل فوراً بولی۔

”بھائی آئے ہوئے ہوں گے مجھے لینے۔ تم میرے ساتھ چلو میں تمہیں ڈراپ کر دوں گی۔“

”نہیں یار تھینک یو۔ میرا گھر تمہارے راستے میں آتا یا کہیں آس پاس ہی ہوتا تو میں تمہاری آفر قبول

لا لیتی لیکن اب صرف میری وجہ سے اتنا آؤٹ داوے جانا۔ یہ بات بالکل مناسب نہیں ہے۔“

اس نے جواب دیا تھا۔ اس دوران چلتے ہوئے وہ لوگ گیٹ تک پہنچ گئی تھیں۔ متناہل جو اس سے مزید

اصرار کرنے کا ارادہ رکھتی تھی اسے گیٹ کے پاس رکتے اور چونکتیدیکھ کر خود بھی رک گئی تھی۔

”سعد یہاں کیسے؟“ وہ گیٹ کے سامنے کھڑی سعد کی گاڑی کو دیکھ کر حیران ہوئی۔ سعد نے ہارن

بجا کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس کی نگاہوں کے تعاقب میں ان سب نے بھی سعد کی طرف دیکھا۔

”سعد آ گیا ہے مجھے لینے۔“ اس نے دوستوں کو مطلع کیا تھا جو آج پہلی مرتبہ اس کے ”دیدار“ سے

بے یاب ہو رہی تھیں۔

”تم نے منع کیا تھا سعد کا ذکر کرنے سے لیکن میں کیا کروں کہ جیسے ہی میں نے کالج کے گیٹ سے باہر

دیکھا تو سامنے ہی گاڑی میں میرا بہترین دوست سعد منیر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا گھر میرے گھر سے قریب ہے اس کے گھر میں اس کے مچی ڈیڈی اور ایک چھوٹا بھائی رہتے ہیں۔ اس کے ڈیڈی۔“

اس کی بات ان سب کے مشترکہ اور بے ساختہ تہقیر کی وجہ سے ادھوری رہ گئی۔ خود وہ بھی اپنی بات پر اب ہنس رہی تھی۔ لائبریری سے نکل کر گیٹ تک آنے تک نمرہ ان لوگوں کو مستنصر حسین کا کتاب میں ذکر ہوئے غلام رسول کے بارے میں بتا چکی تھی۔ دوستوں کو ہنستا ہوا چھوڑ کر وہ انہیں حافظ کبھی گاڑی کے پاس آگئی۔

”جلدی بیٹھو۔ ایک تو یہ تم لڑکیوں کی باتیں کرنے کی عادت۔ اتنے گھنٹے کالج میں ساتھ گزار کر دل بھرتا جو گیٹ پر کھڑے ہو کر حسرتیں پوری کی جاتی ہیں۔“ اس کے بیٹھنے تک وہ بڑبڑاتا رہا۔ ازراہ بڑبڑاہٹ کا برا مانے بغیر وہ اس کے آنے پر حیران ہونے لگی۔

”تم کیسے آگئے۔ کیا نانی امی نے تمہیں فون کر کے مجھے لانے کے لیے کہا تھا؟“ وہ اس کی بات سنی سنی کرتا ڈرائیو کرتے ہوئے اپنی پسند کا کوئی انگلش نمبر لگانے میں مصروف تھا۔

”ڈرائیو چھٹی پر ہے اب نانا ابا کو تو ڈاکٹر نے ڈرائیونگ کرنے سے منع کر رکھا ہے۔ صبح وہ مجھے کالج میں کالج چھوڑ کر گئے تھے۔ مجھے تو بہت بری لگی یہ بات۔ اپنی وجہ سے انہیں ستاؤں۔ کلاسز آف ہور والی ہیں۔ آخری دنوں میں چھٹی بھی نہیں کرنی چاہیے ورنہ میں تو چھٹی ہی کر لیتی۔ دنوں میری واپس واپس واپس پریشان ہو رہے تھے۔ میں نے نانی امی سے کہا اب آپ مجھے بڑا ہونے دیں۔ ساری دنیا لڑکیاں بسوں اور دیکھوں میں سفر کرتی ہیں۔ ایک دن اگر میں بس سے آگئی تو کوئی قیامت تو آجائے گی۔ ویسے بھی انسان کو ہر طرح کے حالات میں ایڈجسٹ کرنا آنا چاہیے۔

وہ اتنے یقین سے بول رہی تھی گویا یہ بات طے تھی کہ سعد کو نانی امی نے ہی اسے لانے کے لیے کہا تھا۔

”تم میری وجہ سے اپنا کوئی پیریڈ تو نہیں چھوڑ آئے۔“ وہ فوراً تھ گیسر میں گاڑی دوڑاتا فاسٹ میوڈ انجوائے کرتا اس کی باتوں کو بڑی لاپرواہی سے سن رہا تھا۔

”کیا آج نہ بولنے کی قسم کھا کر آئے ہو۔“ اس کی مسلسل چپ سے آخر کار وہ چر گئی۔

”فضول باتوں کے جواب میں کیا بولوں۔ جب تمہاری کوئی بات اس قابل لگی کہ اس پر بولا جاوے ضرور بولوں گا۔“ اس نے بڑے پرسکون انداز میں اسے چڑایا۔ وہ اس بات کے جواب میں کچھ بھی نہ

ہولی۔ چند سیکنڈز کی خاموشی کے بعد سعد نے ونڈ اسکرین سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا تو بے ساختہ ہنسی آگئی۔ کھڑکی سے باہر نظریں دوڑاتی وہ بہت ناراض ناراض سی بیٹھی ہوئی تھی۔

پھر سارا راستہ وہ اس سے خفگی کا اظہار کرتی بالکل خاموش رہی تھی یہاں تک کہ سعد نے گاڑی گھر پر لا کر روک دی۔ وہ اسے خدا حافظ کہے بغیر گیٹ میں گھس گئی۔ اپنی یہ حرکت اسے بالکل جائز لگ رہی تھی۔ ذرا سائے کیا آ گیا فضول میں اکڑ رہا ہے۔

”آپ نے سعد سے کیوں کہا تھا مجھے کالج سے لانے کے لیے۔“ سلام کے بعد اس نے اگلی یہی بات کہی تھی نانی امی سے۔

”تم سعد کے ساتھ آئی ہو؟“ وہ التا حیران ہو کر پوچھ رہی تھیں۔

”آپ نے اس سے نہیں کہا تھا۔“ اس نے جیسے تصدیق چاہی۔

”میں کیوں کہتی۔ خود ہی تو صبح اتنے فلسفے جھاڑ کر گئی تھیں کہ میں بڑی ہونچکی ہوں۔ مجھے انگلی پکڑ کر مت چلائیں۔ دنیا کو فیس کرنے دیں وغیرہ وغیرہ۔“ انہوں نے برامانتے ہوئے اس کے کہے جملے دہرائے۔

وہ ایک دم چپ ہو کر کچھ سوچنے لگی۔ اچانک اسے کل کی بات یاد آگئی تھی۔ کل سعد سے ایک کتاب لینے وہ اس کے گھر گئی تھی۔ وہ اسٹڈی میں اس کی مطلوبہ کتاب ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کام میں شاید پانچ سات منٹ لگے ہوں گے۔ اس دوران باتوں باتوں میں اس نے یونہی سرسری اس بات کا ذکر کیا تھا کہ ڈرائیور دو دن کی چھٹی پر جا رہا ہے۔ اس وقت تو ایسا لگا تھا کہ کتاب ڈھونڈتے ہوئے سعد نے اس کی بات اتنی توجہ سے سنی بھی نہیں تھی۔ اس وقت جب کل کی بات یاد آئی تو پتا چلا کہ اس نے بات صرف سنی ہی نہیں تھی بلکہ اسے یاد بھی رکھا تھا۔ وہ یونیورسٹی میں اپنے پیریڈز اور شاید دوسری بہت سی مصروفیات چھوڑ کر اس کی وجہ سے آیا تھا اور اپنے خاص طور پر اس کے لیے آنے کو جتنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

”تمہاری یہ عادت کبھی نہیں بدل سکتی سعد۔“ ہمیشہ کی طرح اس نے سعد کی دوستی پر فخر محسوس کیا پھر وہ فوراً ہی اس کے گھر فون کرنے بیٹھ گئی۔

”سعد تو آج دیر سے آنے کا کہہ کر گیا ہے۔ کہہ رہا تھا شام ہو جائے گی۔“ فون آنٹی نے اٹینڈ کیا تھا اور اس کے سعد سے متعلق استفسار کے جواب میں یہ بات بولی تھی۔

”کوئی ضروری کام ہے تو تم اسے موبائل پر کال کر لو۔“ آنٹی نے اسے مشورہ دیا تھا۔ آنٹی سے گفتگو ختم

کر کے اس نے سعد کا موبائل نمبر ملایا تھا۔

”دور ہو گئی ناراضی۔“ کسی قسم کے سلام آداب اور ہیلو میں الجھے بغیر وہ چھوٹے سٹے میں یہ جملہ بولا۔
”تم نے بتایا کیوں نہیں تھا کہ تم خود سے آئے ہو۔“ اس نے شکوہ کیا۔

”میں کیوں بتاتا اور تمہارے خیال سے تو میں تمہاری فکر اس وقت کرتا ہوں جب نانی امی یا کوئی اور مجھ سے کہتا ہے۔“ جو اب اس نے بھی شکوہ کیا تھا۔

”آئی ایم سوری سعد۔“ اس نے معذرت کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

”انگریزی زبان کا سب سے کثیر استعمال لفظ ہے یہ سوری۔ کسی کو بڑی سے بڑی بات بول دو اور پھر بعد میں ایک سوری کہا اور مسئلہ حل۔ اور دوستوں کے خلوص پر شک کرنے کی تمہاری آج کی عادت تھوڑی ہے جو میں اسے محسوس کروں گا۔“ سعد نے آنے کا وعدہ کیا ہے لیکن وہ کبھی بھی نہیں آئے گا۔ یہ وقت تو اس کا کھیلنے کا ہوتا ہے۔ وہ میری خاطر اپنا پروگرام کیوں خراب کرے گا۔“

”سعد کو میری سالگرہ یاد نہیں رہے گی۔ آ کر گفٹ دینا تو دور کی بات وہ مجھے شکرنا بھول جائے گا۔ اس کے اتنے بے شمار دوست ہیں۔ اگر ایک ایک کی سالگرہ یاد رکھنے لگا تو ہو گیا کام۔“ یہ سب تو سننے کا میں عادی ہوں میڈم اور ہمیشہ کی طرح بغیر برامانے یہ وضاحت بھی کرنے کا کہ میرے بہت سارے دوست ہیں لیکن ان بہت سے دوستوں میں تم سب سے خاص اور سب سے اہم دوست ہو۔ حالانکہ کتنا انسٹنٹ لگتا ہے گھڑی گھڑی کسی کو اپنے خلوص کا یقین دلانا۔“

اس نے بڑے تپے ہوئے انداز میں فریاد کی ٹھیک ٹھاک کھنچائی کی تھی۔

”اچھا اب فون بند کرو۔ مجھے اپنی اسائنمنٹ کے لیے کچھ سروے کرنا ہے اور اس وقت میں اس سلسلے میں ایک فارماسیوٹیکل کمپنی جا رہا ہوں۔“ اس سے بات کرتے ہوئے اسے پہلے ہی اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ ڈرائیو کرتے ہوئے بات کر رہا ہے اور اب یقیناً وہ اپنی منزل پر پہنچ گیا تھا۔ سعد کی بات سنتے ہی اس نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔



یونیورسٹی میں ایڈمیشن کے لیے پلائی کرنے سے پہلے اس نے نانا ابا سے پوچھا تھا کہ آنرزز کے لیے کس مضمون کا انتخاب کرنا چاہیے۔ ”تم ماس کیونی کیشن (جرنلزم) کہہ رہی تھیں نا۔ وہی ٹھیک ہے۔“ نانا ابا نے جواباً کہا تھا۔

”وہ تو میری ٹیچر نے کہا تھا۔ آپ بتائیں مجھے کہاں ایڈمیشن لینا چاہیے۔ جہاں آپ کہیں گئے ہیں ایڈمیشن لوں گی۔“

”ماس کیونی کیشن ہی ٹھیک رہے گا۔ میرا خیال ہے تمہارا رجحان بھی اس طرف ہے۔“ نانا ابا نے منانت سے جواب دیا۔

پھر نانا ابا کے مشورے کو سامنے رکھتے ہوئے اس نے ایڈمیشن کے لیے اپلائی کر دیا۔ اس کا اپنے مطلوبہ ڈپارٹمنٹ میں ایڈمیشن ہو گیا تو اس خوشی کو اس سے بھی بڑھ کر نانا ابا اور نانی امی نے منایا تھا۔

”ایسا تو میں نے کوئی کارنامہ نہیں کیا۔“ وہ نانا ابا اور نانی امی کے ساتھ شاپنگ سینٹر آئی تھی۔ نانا ابا اسے اس کی پسند کی شاپنگ کروا رہے تھے۔

”ہمارے لیے تو بہت بڑی بات ہے۔ ہماری فریاء یونیورسٹی تک پہنچ گئی۔“

اسے ڈھیر ساری شاپنگ کرانے کے بعد انہوں نے ڈنر بھی باہر کیا تھا۔ نانا ابا کے ساتھ اس قسم کی تفریح کا مزہ وہ پہلی مرتبہ لے رہی تھی۔ ان لوگوں کی ایجنج اب اس قسم کی تفریحات کی نہیں تھی لیکن پھر بھی اس کی خاطر اکثر نانی امی کہیں نہ کہیں باہر کھانے کا پروگرام بنالیا کرتی تھیں۔ نانا ابا البتہ ان پروگرامز میں کبھی شرکت نہیں کرتے تھے۔ آج جب انہوں نے خود ہی یہ پروگرام ترتیب دیا تو وہ اس بات پر خوش بھی ہوئی تھی اور حیران بھی ہوئی تھی۔



پہلے روز وہ یونیورسٹی آئی تو دل بہت تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ وہ بہت زیادہ ایکسائینڈ تھی۔ یہیں اس یونیورسٹی میں اس کی ماما نے پڑھا تھا ان راہدار یوں اور درود یوار نے اس کی ماما کو دیکھ رکھا تھا۔ پہلے دن صرف دو تعارفی کلاسز ہوئی تھیں۔ اس کے بعد وہ لوگ فارغ تھے۔

وہ مناہل کو ساتھ لے کر پوری آرٹس فیکلٹی گھومی۔ ”بڑی مشہور ہوں میں اپنے ڈپارٹمنٹ میں۔ پوری آرٹس فیکلٹی میں۔“

”آپ کسی سے بھی میرا نام لے کر دیکھ لیں۔ وہ فوراً پہچان جائے گا۔“

”پتا نہیں ان درود یوار اور ان لوگوں نے آپ کو یاد رکھا بھی ہے یا نہیں۔“ اس نے اپنی آنکھوں کی سطح کیلی ہوتی محسوس کی تھی۔ اپنے ڈپارٹمنٹ واپس آئیں تو اچانک ہی مناہل نے چاٹ کھانے کا پروگرام

بنالیا۔ ”کیمسٹری ڈپارٹمنٹ کی چاٹ بہت مشہور ہے۔ چلو کھا کر دیکھتے ہیں۔“

وہ بغیر اختلاف کیے جانے کے لیے تیار ہوگئی لیکن اسی وقت سامنے سے سعد آتا نظر آ گیا اور اسے دیکھ کر وہ فوراً رک گئی تھی۔

”میں نے سوچا تمہارا یونیورسٹی میں پہلا دن ہے۔ تمہیں ویلکم تو کہہ دوں۔“ ان دونوں سے ہائے بیباکی کرتا وہ فریاد سے مخاطب ہوا تھا۔

”میں چلتی ہوں فریاد۔“ منابل کی بات پر سعد نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ اس نے سر ہلا کر اسے خدا حافظ کہہ دیا۔

”تمہاری دوست میری شکل دیکھتے ہی ایسے بھاگی ہے جیسے اس نے مجھ سے قرض لے رکھا ہے اور اب اس سے پہلے کہ میں رقم کا تقاضا کرتا وہ جلدی سے چلی گئی۔“ وہ سعد کے چرنے پر ہنس پڑی۔

”کوئی لڑکی اگر اتنور کر دے تو تم لڑکوں کو تکلیف کتنی ہوتی ہے۔“ وہ اس بات پر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ مزید بولی۔ ”منابل اصل میں میری ہی وجہ سے تم سے چرنے لگی ہے۔“ پھر اس کے بعد وہ اسے غلام رسول والی بات بتانے لگی تھی۔ ساری بات سن کر سعد بھی ہنسنے لگا۔

”یعنی جب میں نہیں ہوتا تب بھی میرا ذکر تو ہوتا ہی ہے۔ تب ہی میں کہوں، مجھے اکثر بیٹھے بیٹھے ہچکیاں کیوں آنے لگتی ہیں۔“ کوریڈور میں اس کے ساتھ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا وہ شوخی سے بولا۔

”اچھا لگ رہا ہے نافر۔ اسکول کے بعد اب پھر ہم لوگ ایک ہی جگہ آ گئے ہیں۔“ سعد کی بات پر اس نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔

”کیسا لگا تمہیں اپنا ڈپارٹمنٹ؟“

”آج تو پہلا دن ہے۔ ابھی تو ہر چیز نئی نئی اور اجنبی سی لگ رہی ہے۔ کلاس فیلوں کے نام تک ڈھنگ سے یاد نہیں ہوئے ہیں۔ آہستہ آہستہ ایڈجسٹمنٹ ہوگی۔“

”لونا موں اور اجنبیت کی بھی تم نے خوب کہی۔ تمہارے ڈپارٹمنٹ کے بعض لوگوں سے تو میری اچھی خاصی واقفیت ہے۔ جیسے یہ سامنے کھڑی اسٹوڈنٹس کا جو گروپ ہے۔ ان میں جو بلیو کپڑوں میں لڑکی ہے

یہ ایم اے فائنل ایڈورٹائزنگ کی حیا اقبال ہے۔ اب اگر تمہارا اس کے نام پر حیران ہونے کا دل چاہ رہا ہے تو شوق سے حیران ہوتی رہو ورنہ سچ بھی ہے کہ یہ ”حیا“ ہے۔“ سعد کی بات سننے کے دوران وہ اس

لڑکی کو بغور دیکھتی رہی تھی جو بے حد فننگ والے کپڑے پہنے ہوئی تھی۔ شانے پر ایک طرف لاپرواہی سے دوپٹہ ڈالا تو گیا تھا لیکن اس کا سب سے بڑا مصروف فرش پر جھاڑو دینا تھا اور وہ اپنا مقصد پورا بھی کر رہا

تھا۔ ناپسندیدگی سے اس لڑکی کو دیکھنے کے بعد وہ دوبارہ سعد کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”ماں باپ بھی بچوں کے نام بغیر سوچے سمجھے رکھ دیتے ہیں۔“ وہ جیسے ابھی تک حیا نام کو انجوائے کر رہا تھا۔

”تمہیں بڑی اس کے بارے میں معلومات ہیں۔ میں بلاوجہ خوش ہو رہی تھی کہ تم مجھ سے ملنے آئے ہو۔ اب پتا چلا یہاں آنا جانا بہت پرانا ہے۔“ وہ اس کی دوسرے ڈپارٹمنٹس کی لڑکیوں کے بارے میں انفارمیشن پر طنز یہ انداز میں بولی۔

”میں کیوں خاص طور پر انفارمیشن رکھوں گا۔ اب کوئی بندہ اپنی کسی کوالٹی کی بدولت خود بخود ہی مقبول ہو جائے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ ابھی تو جنوری ہے۔ ذرا اگر میاں آنے دو پھر دیکھنا۔ کیسا یہاں پر دوسرے ڈپارٹمنٹس کے لڑکوں کا رش لگے گا۔ اس کے سمر ڈریسز کی تو پوری یونیورسٹی میں دھوم ہے۔“ سعد کی کیننگی پر غصے کے ساتھ ساتھ اسے بے اختیار ہنسی بھی آ گئی۔

”تم لڑکے کتنے خبیث ہوتے ہو سعد! دوسروں کو چھوڑو تم خود ہی تھوڑی شرم کر لو۔“

”اچھا اب شرم ماؤں بھی میں۔ اور وہ حیا اپنے نام کی رتی برابر بھی لاج نہ رکھے۔ بھئی سیدھی بات ہے یہ کیٹ واک اور سمر ڈریسز ہم لڑکوں ہی کے لیے ہوتے ہیں اور یہ تو زیادتی ہے کہ اتنا اہتمام ہمارے لیے ہو اور ہم اسے دیکھیں بھی نہیں۔“

”اور کن کن ڈپارٹمنٹس کی ”حیاؤں“ سے آپ کی واقفیت ہے سعد منیر۔ لگتا ہے یونیورسٹی میں سارا وقت اسی مصروفیت کی نذر ہو جاتا ہے۔“ وہ بڑے طنز سے پوچھ رہی تھی۔

”ارے ابھی تمہیں آئی بی اے کے لڑکوں کی مارکیٹ ویلیو کا پتا نہیں ہے اس لیے یہ بات بول رہی ہو۔ لڑکیاں ہم آئی بی اے کے لڑکوں کی دیوانی ہیں اور اس میں بھی بات اگر میرے جیسے بندے کی ہو تو سعد منیر جیسے بینڈزم بندے کو کسی کے پیچھے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے پیچھے لڑکیوں کی لائن ہے۔ یہ تو میں تمہاری وجہ سے یہاں آ گیا ہوں۔“ وہ اس کے بینڈزم کہنے پر چھٹ بولی۔

”آئینہ کتنے دنوں سے نہیں دیکھا؟“

”روز دیکھتا ہوں اور وہ ہر روز مجھ سے کہتا ہے ”سعد یو آر ڈا ہیٹ“ اور یہ بھی کہتا ہے کہ اگر میری بات کا یقین نہیں تو جا کر فریاء عبدالرحمان سے پوچھ لو وہ بھی یہی کہے گی۔“ وہ بڑے پر یقین انداز میں بولا۔ وہ اس کے پر یقین اور اعتماد سے بھر پور انداز پر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

پھر جب تک ڈرائیور کے آنے کا ٹائم نہیں ہو گیا وہ دونوں ساتھ رہے تھے۔ گھر پہنچی تو حسب معمول نانی امی لٹچ پر اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ کھانے کے بعد ان کے ساتھ باتیں کرتے کرتے وہ ان کے کمرے ہی میں سو گئی تھی۔

”کیسا ہاتھ ہارا یونیورسٹی میں پہلا دن؟“ نانا اباسے شام کی چائے پر ملاقات ہوئی۔ ”بہت اچھا۔ میں تو بس سارا وقت یہی سوچتی رہی کہ یہیں میری ماما نے بھی پڑھا ہے۔ بس صرف یہ فرق ہے کہ اس وقت یہ جرنلزم کا ڈپارٹمنٹ کہلاتا تھا اور اب۔“

وہ بے ساختگی میں سوچے سمجھے بغیر بول گئی تھی اور جیسے ہی اپنی اس بے وقوفی کا احساس ہوا وہ ایک دم بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہو گئی تھی۔ بہت خوف زدہ نگاہوں سے اس نے ان کی طرف دیکھا۔ اتنی جرات تو کبھی نانی امی کو بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ ان سے بیٹی اور داماد کے بارے میں کوئی بات کر سکیں۔ اس کی تو حیثیت ہی کیا تھی۔ اس کے چہرے پر پھیلا خوف اور گھبراہٹ نانی امی سے مخفی نہیں تھا۔ انہوں نے فوری طور پر اس کشیدہ صورت حال کو قابو میں کرنے کی کوشش کی۔

”پلاؤ کے لیے بیچنی میں نے تیار کر کے رکھی ہوئی ہے۔ چاول تم بگھار لینا۔ اسلم تو چاولوں کا حلوہ بنا دیتا ہے۔ وہ جاپانی لوگ جس طرح کے چپکے ہوئے چاول کھاتے ہیں کچھ کچھ وہی شکل بنا دیتا ہے۔“ مسکراتے ہوئے وہ اس طرح بولیں گویا لحد بھر پہلے یہاں کوئی تناؤ پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ نانا اباسے خاموشی سے چائے پی رہے تھے۔ ان کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔

”میں نماز پڑھنے جا رہا ہوں۔“ نانی امی سے کہتے ہوئے وہ گت کی طرف بڑھ گئے۔ وہ بہت مایوسی اور دل گرفتگی کے عالم میں انہیں جاتا ہوا دیکھتی رہی تھی۔

”اب تو آپ انہیں معاف کر دیں نانا اباس! میری ماما آپ کی بیٹی بھی تو ہیں۔ اتنے ظالم اور کھنڈر مت بنیں۔ پلیز انہیں معاف کر دیں۔ پتا نہیں میں اپنی زندگی میں کبھی آپ کے منہ سے ان کا نام سن بھی پاؤں گی یا نہیں۔ آپ کے لبوں سے جب وہ نام ادا ہوگا تو کتنا خوبصورت لگے گا۔ ضوفشاں۔ آپ کی معافی کے بغیر ان کی روح تک بے چین ہے۔ پتا نہیں یہ میری حد سے بڑھی ہوئی حساس سوچ ہے یا کیا ہے لیکن میں نے ماما کو خواب میں بھی کبھی خوش نہیں دیکھا۔ مجھے ایسا لگتا ہے مرنے کے بعد ان کی روح بے قرار ہے۔ جس روز آپ انہیں معاف کر دیں گے شاید اسی روز ان کی روح قرار پائے گی۔“

اذان ہونے تک وہ لان میں اکیلی بیٹھی رہی۔ اذان کی آواز پر وہ چونکی تو اسے احساس ہوا کہ اتنی دیر

سے بیٹھی وہ بے آواز آنسو بہا رہی ہے نانی امی تو نانا ابا کے جاتے ہی اندر چلی گئی تھیں۔ دوپٹے سے چہرہ صاف کرتی وہ جلدی سے اٹھ گئی تھی۔

نماز کے بعد وہ دانستہ کچن میں گھسی رہی۔ اسے نانا ابا کا سامنا کرتے خوف آ رہا تھا لیکن کھانے کی میز پر تو ان سے سامنا لازمی تھا۔ وہ راتے کا پیالہ ہاتھ میں لیے ٹیبل پر آئی تو نانا ابا کھانے کے انتظار میں بیٹھے نظر آئے۔

”تمہاری نانی امی کہاں رہ گئیں۔ سخت بھوک لگ رہی ہے مجھے۔“ ان کا انداز معمول کے مطابق تھا۔
 ”وہ آ رہی ہیں۔ شاید کسی کا فون آ گیا ہے۔“ رائیہ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس نے اپنی کرسی سنبھالی۔ وہ بڑے غور سے اس کے چہرے پر پتا نہیں کیا چیز دیکھ رہے تھے۔

”کھانے کے بعد واک کرنے چلیں گے۔ پھر واپسی میں آکس کریم کھاتے ہوئے آئیں گے۔“ وہ اس کے اندیشوں کو غلط ثابت کرتے بڑے خوشگوار موڈ میں مخاطب تھے۔ اسے کچھ شک سا ہوا کہ شاید انہوں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر یہ بات پالی ہے کہ وہ روئی تھی۔

”لیکن آپ کو تو بیٹھا منع ہے۔“ اپنی نظریں ٹیبل پر مرکوز کرتے ہوئے اس نے کہا۔
 ”مجھے منع ہے تمہیں تو نہیں۔ تم کھانا میں تمہیں کھاتے دیکھ کر ہی آکس کریم کا مزہ لے لوں گا۔“
 نانی امی ڈانٹنگ روم میں داخل ہوئیں تو وہ ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ”کس کا فون آ گیا تھا۔ ہم دونوں کی بھوک سے بری حالت ہو رہی ہے۔“

کھانے کے فوراً بعد وہ اسے اپنے ہاتھ واک کرنے لے آئے تھے۔ واک کے دوران وہ اسے اپنی یونیورسٹی کے زمانے کی باتیں سناتے رہے تھے۔ وہ ان کی باتیں بڑی دلچسپی سے سن رہی تھی۔ اسی دوران انہوں نے اسے پیرا سٹور سے بہت ساری آکس کریم بھی دلوائی تھی۔

”اتنی ساری نہیں کھاؤں گی میں نانا ابا۔“ کون کھاتے ہوئے اس نے انہیں مزید خریدنے سے روکا۔
 ”کوئی بات نہیں رکھ کر رکھ کر کھانا۔“ اس کے انکار کو اہمیت دینے بغیر انہوں نے دو تین فلیور کے لیٹرے ایکس خرید لیے تھے۔

”آپ میرا وزن بڑھوانے کا پورا پورا بندوبست کر رہے ہیں۔“ وہ اس کی بات سن کر مسکرائے۔
 ”نہیں بڑھے گا وزن۔ یونیورسٹی میں جو خوب چلنا چلانا ہوگا تو خود بخود ہی کیلوریز برن ہو جایا کریں گی۔“ ان کے اطمینان دلانے پر وہ بھی ہنس پڑی تھی۔

”کیا نانا ابا کو میرے رونے کا پتہ چل گیا تھا۔ اس کے لیے وہ مجھے بہلانے کی کوشش کر رہے تھے۔“ وہ سونے کے لیے اپنے کمرے میں آئی تو ان کے کچھ دیر پہلے کے رویے پر غور کرنے لگی۔ انہوں نے ایسا کچھ کہا نہیں تھا لیکن پھر بھی اسے ایسا لگا جیسے جتنی دیر وہ اسے ساتھ لیے گھومتے رہے ان کی آنکھیں اس سے مسلسل یہی کہتی رہی تھیں۔

”فری! تم رو یا مت کرو۔ جب تم روتی ہو تو میرے دل کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔“



یونیورسٹی میں اس کا زیادہ وقت مناہل کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ وہ بہت دلچسپی اور سنجیدگی سے اپنی اسٹڈیز میں مصروف تھی۔ اپنے ڈپارٹمنٹ کے بعض سینئر پروفیسرز کے بارے میں اسے یقین تھا کہ انہوں نے اس کی ماما کو بھی ضرور پڑھایا ہوگا۔ اگر وہ واقعی اتنی آؤٹ اسٹینڈنگ اسٹوڈنٹ تھیں تو اپنے اساتذہ کو ضرور یاد ہوں گی۔ اچھے طالب علموں کو اساتذہ کبھی نہیں بھولتے لیکن وہ ابھی اپنی ماما کے حوالے سے کسی سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ پہلے وہ خود اتنی اچھی اور آؤٹ اسٹینڈنگ اسٹوڈنٹ بن کر تو دکھا دے کہ پروفیسرز فوراً یقین کر لیں کہ ہاں یہ ذہین ترین لڑکی صوفیستاں فاروق کی بیٹی ہو سکتی ہے۔ اسی دھن میں وہ بے تحاشا محنت کر رہی تھی۔ کسی معمولی سے ٹیسٹ یا عام سے اسائنمنٹ کو بھی وہ بڑی سنجیدگی سے لیتی تھی۔ کمرے میں موجود ماما کی ڈھیر ساری کتابیں ان کے لیکچرز، نوٹس اور اسائنمنٹس کا بھی اکثر وہ فارغ اوقات میں مطالعہ کیا کرتی تھی۔

اسے پڑھائی میں اتنا زیادہ سنجیدہ دیکھ کر سعد اکثر چھیڑنے والے انداز میں کہا کرتا۔ ”لگتا ہے ساری محنت گولڈ میڈل اور اخباروں میں تصویر شائع کروانے کے لیے ہو رہی ہے اور سردار علی صابری گولڈ میڈل تو لازمی ملے گا تمہیں۔“



فرسٹ سمسٹر کا امتحان دے کر وہ لوگ سیکنڈ سمسٹر میں آچکے تھے۔ اس روز وہ یونیورسٹی سے گھر واپس آئی تو لاؤنج میں نانا ابا اور نانی امی کے ساتھ شجاع انکل اور ایک انجان صورت لڑکا بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے سلام کا سب سے زیادہ گرم جوشی سے جواب شجاع انکل نے دیا تھا۔

”میرا خیال ہے تین چار سال بعد دیکھ رہا ہوں میں تمہیں۔ لاسٹ ٹائم تمہاری آنٹی کے ساتھ کراچی آیا تھا تب دیکھا تھا تمہیں۔“ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

”ڈیڈی! اب آپ وہ روایتی جملہ مت بلے لے گا کہ تب تم تو اتنی چھوٹی سی تھیں اب اتنی بڑی ہو گئی ہو۔“ ان کے برابر میں نہ موشی سے بیٹھا وہ لڑکا یکدم بول اٹھا۔ نانا ابا اور نانی کے لبوں پر اس کی بات سن کر مسکراہٹ دوڑ گئی جبکہ شجاع انکل تو باقاعدہ تہمت لگا کر ہنس پڑے تھے۔

”اچھا ہوا تم نے ٹوک دیا حمزہ! ورنہ میں واقعی یہی بات کہنے والا تھا۔“

انکل کے حمزہ کہنے پر وہ اسے پہچانی تھی اور بے اختیار اس کے لبوں پر بھی انکل کی طرح ”حمزہ تم اتنے بڑے ہو گئے“ والی بات آتے آتے رہ گئی۔ حمزہ کو اس نے بچپن کے بعد دوبارہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شجاع انکل اور تازیہ آئی سے البتہ اس دوران کئی دفعہ ملنا ہوا تھا۔

جب کے حمزہ اور اب کے حمزہ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اگر وہ شجاع انکل کے ساتھ نہ بیٹھا ہوتا اور وہ اسے حمزہ کہہ کر نہ مخاطب کرتے تو وہ اسے کبھی بھی پہچان ہی نہیں سکتی تھی۔ اس وقت کا دبلا پتلا سا بچہ اب ایک مینڈسم اور اسارٹ لڑکے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ اسے اپنی طرف غور سے دیکھتا پا کر مسکرایا تھا۔

”ہیلو فریا!“ اس کے ہیلو کے جواب میں اس نے مسکراتے ہوئے ہیلو کہہ دیا۔ وہ لوگ یقیناً رنجیرا سی کا انتظار کر رہے تھے۔ کیونکہ نانی امی نے فوراً ہی سب سے کھانے کے لیے کہا تھا منہ ہاتھ دھو کر وہ بھی ڈائننگ روم میں آ گئی۔ شجاع انکل کی نانا ابا اور نانی امی سے باتیں ہو رہی تھیں جبکہ حمزہ بھی اسی کی طرح ناموشی سے کھانا کھاتے ہوئے ان لوگوں کی باتیں سن رہا تھا۔ ان کی باتوں ہی سے اس نے اندازہ لگایا تھا کہ شجاع انکل فیملی کی ایک بہت ہی قریبی شادی میں شرکت کی غرض سے کراچی آئے تھے۔ آئی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور فرمین اپنے ایگزیزیز میں مصروف تھی اس لیے وہ زبردستی حمزہ کو اپنے ساتھ گھسیٹ لائے تھے جو اپنی گونا گوں مصروفیات کے سبب آنے کے لیے قطعاً تیار نہیں تھا لیکن خاندان کی اتنی قریبی شادی میں تہا شرکت کر کے وہ رشتہ داروں کی ناراضی مول نہیں لینا چاہتے تھے اسی لیے اس دو روزہ قیام کے لیے اسے بھی ساتھ لے آئے تھے۔

”اور بھئی سنا ہے ماس کیونی کیشن میں آنرز ہو رہا ہے۔“ سو ہیٹ ڈش کھاتے ہوئے شجاع انکل ایک رتبہ پھر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

اس کے ”جی“ کہنے پر انہوں نے اس موضوع میں مزید دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”آگے کیا ارادے ہیں۔“ ان کا سوال سن کر اس نے ایک پل کے لیے کچھ سوچا۔ پھر سنجیدگی سے

بولی۔

”اس کے بعد اسی سبکیٹ میں ماسٹرز کروں گی۔ ایم اے فائنل میں اسپیشلائزیشن کے لیے پڑھاؤں گی اور انٹرن شپ آپ ہی کے اخبار میں کروں گی۔“

وہ اس کے بے تکلفانہ انداز پر محفوظ ہوتے ہوئے قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

”صرف انٹرن شپ کیوں۔ تم جا ب بھی وہیں کرنا۔“ میز پر موجود باقی تمام افراد بھی اس گفتگو کو انجوائے کر رہے تھے۔

شجاع انکل آئے تو نجی کام سے تھے لیکن اس دو دن کے مختصر ترین پروگرام میں بھی وہ اپنے بہت ہی خاص اور قریبی صحافی دوستوں سے مل رہے تھے۔ یوں وہ گھر پر بہت ہی کم وقت رکے تھے، حمزہ بھی اکثر جگہوں پر ان کے ساتھ چلا جاتا تھا۔

اسے حمزہ کے اس طرح ہر جگہ انکل کے ساتھ جانے پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ اس سے تھوڑی بہت گفتگو کے بعد ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ جرنلزم صرف پڑھ ہی نہیں رہا بلکہ بڑی سنجیدگی سے اس میں کیریئر بنانے کا بھی ارادہ رکھتا ہے۔ شجاع انکل کی طرح جرنلزم اس کا شوق، عشق اور جنون سب کچھ تھا۔ جس فیلڈ میں اپنا کیریئر بنانے کا وہ سوچ چکا تھا۔ اس سے متعلق تجربہ اور پیشہ ورانہ مہارت دوران تعلیم ہی حاصل کرنے کے لیے وہ شجاع انکل کے ساتھ ساتھ رہا کرتا تھا۔ اس سے پہلے تو اس نے اخبار میں حمزہ شجاع احمد کے نام سے چھپا کوئی آرٹیکل، فیچر یا سروے پڑھنے کی زحمت نہیں کی تھی لیکن اب اس سے ملنے کے بعد وہ اس کے نام سے چھپنے والی تحریروں کو خاص طور پر پڑھنے لگی تھی۔

نانی امی کے بہت ناراض ہونے اور یہ کہنے پر کہ صرف شکل دکھانے کے لیے آنے کی ضرورت ہی کیا تھی، شجاع انکل نے ایک روز مزید قیام کر لیا تھا۔



حمزہ اکیلا بیٹھائی وی دیکھ رہا تھا وہ اسے کہنی دینے کے لیے لاؤنج میں آگئی۔ نانا ابا اور شجاع انکل لان میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے جبکہ نانی امی جلدی جلدی رات کے کھانے کا اہتمام کرنے میں مصروف تھیں۔ حمزہ نے اسے آتا دیکھ کر ٹی وی کی آواز ڈرا کم کر دی۔

”پڑھائی کے علاوہ کیا مصروفیات ہیں تمہاری، میرا مطلب ہے تمہاری ہابیز کیا ہیں۔“ وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”کچھ خاص نہیں ہیں۔ فارغ وقت میں ٹی وی دیکھ لیتی ہوں۔ کبھی کوئی بک پڑھ لی یا انٹرنیٹ پڑھتی ہوں۔“

رچنگ۔ بس جیسا موڈ ہوتا ہے وہی کام کر لیتی ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”آپ تو میرا خیال ہے فارغ وقت میں بھی خبروں اور رپورٹنگ وغیرہ کے بارے میں سوچتے رہتے ہوں گے یا پھر انکل سے اپنے کسی فیچر یا آرٹیکل کے لیے درکار معلومات حاصل کرتے رہتے ہوں گے۔“ ان دونوں میں اس نے حمزہ کے بارے میں جو اندازہ لگایا تھا وہ جھٹ بیان کر دیا تھا۔ اس وقت فارغ بیٹھا ہوا تھا وہ بی بی سی پر خبریں دیکھنے میں مگن تھا۔ ایسے میں وہ یہی سوچ سکتی تھی کہ حمزہ خبروں اور اخباروں کے علاوہ کچھ سوچتا ہی نہیں۔ وہ اس کے کمٹنس پر بھرپور اندازہ میں مسکرایا۔

”اتنا بھی بور نہیں ہوں میں۔ اصل میں ایک دم سے بے تکلف ہونے کی میری نیچر نہیں ہے۔ جو لوگ مجھے زیادہ قریب سے نہیں جانتے۔ وہ مجھے بہت خود پرست اور شاید مغرور بھی سمجھتے ہیں۔ میں ہر ایک سے دوستی نہیں کرتا لیکن جس سے دوستی ہو جائے پھر اس کے ساتھ میں بہت خوش مزاج زندہ دل اور ہرٹا پک پر بے تکان بولنے والا شخص بن جاتا ہوں۔“ وہ اس کے جملوں پر مسکرائی۔

”اس کا مطلب ہے یہ Communication Ethics اور مختلف ریسرچ رپورٹس پر عالمانہ گفتگو صرف لوگوں کو خود سے دور رکھنے کے لیے ہوتی ہے۔“ سعد کی صحبت کا اور کوئی فائدہ ہوا تھا یا نہیں لیکن وہ حاضر جواب اور صاف گو ضرور ہو گئی تھی۔

اس بار وہ تہتہ لگا کر ہنس پڑا۔ ”تم بہت چیخ ہو گئی ہو۔ مجھے تو تمہارا وہی اسٹائل یاد تھا جب تم اسلام آباد ہمارے گھر آئی تھیں۔ کس طرح ڈری سہی سارا وقت بڑی امی کے پیچھے چھپی رہتی تھیں۔ ہم لوگ کھانے کے لیے بلا تے تو آنے سے منع کر دیتی تھیں۔ مجھے تو یقین نہیں آ رہا یہ آؤٹ اسپوکن لڑکی وہی ڈری سہی کی فریاء ہے۔“

حمزہ کے یاد دلانے پر وہ اس وقت کو یاد کر کے مسکرا دی۔

”تم اس کے بعد کبھی آئیں کیوں نہیں؟“

”آپ لوگ بھی تو کبھی نہیں آئے۔“ حمزہ کی بات کا اس نے برجستہ جواب دیا۔

”یہ آپ کیا ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے میں تم سے اتنا بڑا تو ہرگز نہیں ہوں کہ تمہیں میرا احترام کرنا پڑے۔“ حمزہ نے اسے فوراً ٹوکا۔

”دراصل میری بھی کچھ آپ کی جیسی عادت ہے۔ ایک دم سے بے تکلف ہو جانا مجھے بھی اچھا نہیں لگتا۔ آپ کے تو چنانچہ دوستوں کی تعداد کتنی ہے لیکن میرے دوستوں کی تعداد بہت کم ہے۔“ وہ سنجیدہ

لیجے میں بولی۔

”تو پھر ایسا کرو مجھے بھی دوستوں کی اس مختصر سی فہرست میں شامل کر لو اور اب یہ آپ وغیرہ بالکل مہربان کہنا۔“

حمزہ کے دوستانہ انداز پر اس نے سر ہلادیا۔

لاؤنج کا دروازہ کھول کر اندر آتے سعد کو دیکھ کر وہ خوش ہو گئی۔ ”یقیناً لان میں اس کی نانا ابا سے سلام ہو چکی تھی اور انہوں نے ہی اسے فریا کی لائونج میں موجودگی کے بارے میں بتایا تھا۔“ یہ سعد ہے ابھی ہم دوستوں کی بات کر رہے تھے ناں۔ بس یہ سمجھ لیں کہ سعد میرا سب سے پرانا اور سب سے اچھا دوست ہے۔“ اس کے تعارف کرانے پر حمزہ نے کھڑے ہو کر بڑی خوش دلی سے سعد سے ہاتھ ملایا تھا۔

”میں حمزہ ہوں۔ آپ کی دوست کا کزن اور آج سے دوست بھی ہوں۔ یوں سمجھ لیں فریا کی دوستوں کی کتاب میں تازہ ترین اضافہ ہوں۔“

جواب میں سعد نے بھی خوشگوار انداز میں مسکراتے ہوئے اس سے ہائے ہیلو کی اور پھر سامنے رکے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ”آج ایک بہت ہی مشکل Presentation سے جان چھٹی ہے۔ میں نے سوچ فراغت کی خوشی میں تھوڑا سا تمہارا بھیج دیا جائے۔“ اس نے فریا سے کہا۔

”کیا پڑھ رہے ہیں آپ؟“

”میرا ایم بی اے آنرز اختتام کے قریب ہے۔ بس ایگزیمز ہونے ہی والے ہیں۔“ حمزہ کے استفسار پر سعد نے اپنی پڑھائی کے متعلق بتایا تھا۔

”پتا ہے سعد حمزہ فیوچر کا بہت بڑا جرنلسٹ ہے۔ یہ نانا ابا کی پیشین گوئی ہے اور تمہیں تو پتا ہی ہے وہ جس کسی کے بارے میں جو رائے دیتے ہیں وہ ہمیشہ درست ثابت ہوتی ہے۔“ اس نے نانا ابا کی کئی بات سعد کو بتائی۔

”پھر تو ہم لوگوں کو ان سے ڈرنا چاہیے۔ اگلے وقتوں میں شریف لوگ پولیس تھانہ عدالت کے نام سے ڈرا کرتے تھے اب صحافیوں سے بھی ڈرنا پڑتا ہے۔ بڑی پاورز ہوتی ہیں۔ بھئی ان لوگوں کے پاس۔ پوری حکومتی مشینری کو ہلا کر رکھ سکتے ہیں۔ ویسے اب ذکر چھڑا ہی ہے تو ذرا اس بارے میں تو بتائیں کہ یہ آج کل جو جیو جرنلزم اور پاپارازیوں کا ایشو بہت زبردست طریقے سے اچھا لاجاتا ہے اس سب کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟“

حزہ سعد کی بات کے جواب میں بڑی روانی سے بولنا شروع ہو گیا۔ فریا، حمزہ کی بات دلچسپی سے سن رہی تھی لیکن نانی امی نے اسے کچن میں بلا لیا تو وہ اس گفتگو سے محروم کچن کی طرف چلی گئی تھی۔ نانی امی کی مدد کرانے کے ساتھ ساتھ اس نے ان دونوں کے لیے چائے بھی تیار کر لی تھی۔ چائے لے کر آئی تو وہ دونوں شعیب اختر کے بولنگ ایکشن پر باتیں کر رہے تھے۔

”کیا زبردست اسپینڈ ہے آپ لوگوں کی۔ اتنی جلدی کھیلوں کی خبروں تک پہنچ گئے۔“ سینئر میبل پر لڑے رکھتے ہوئے اس نے کہا۔ حمزہ اس کی بات سن کر ہنسنے لگا جبکہ سعد ٹرے میں سے کپ اٹھا کر جلدی جلدی چائے پینے لگا۔ حمزہ نے اس کی بے تکلفی کو دلچسپی سے دیکھا۔ فریا نے کپ اٹھا کر حمزہ کو پکڑا یا تھا۔ اس نے شکریہ کے ساتھ کپ لے لیا تھا۔ جب تک اس نے پہلا گھونٹ لیا سعد کپ خالی کر چکا تھا۔

”چلتا ہوں میں فری! تم تو کچن میں بڑی ہو۔ میں ذرا آج جم کے فرینڈز سے مل آؤں۔ بڑے دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی۔“

وہ فوراً ہی اٹھ گیا تھا۔

رخصت ہوتے وقت شجاع انکل نے اسے بڑے پیار سے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خوب ساری دعاؤں کے ساتھ خدا حافظ کہا۔ ان سے وہ جب بھی ملی اس نے ان کے انداز میں شفقت اور محبت کے علاوہ کوئی تیسری چیز نہیں پائی تھی۔ حالانکہ اصولاً انہیں اس سے نفرت ہونی چاہیے تھی۔ شاید وہ بہت اعلیٰ ظرف تھے یا پھر وہ صوفیوں کی محبت آج بھی ان کے دل میں کہیں چھپی بیٹھی تھی اور یہی محبت اس کی بیٹی سے اچھے سلوک اور محبت و شفقت کے لیے مجبور کرتی تھی۔ اگرچہ وہ ایک شادی کی تقریب میں شرکت کے لیے آئے تھے لیکن پھر بھی اس کے لیے تحائف لانے نہیں بھولے تھے۔

”محبت شاید اسی بے اختیاری کیفیت کا نام ہے۔ جس میں انسان کوئی بھی نفع نقصان سوچے بغیر مبتلا ہو جاتا ہے ورنہ آپ میں ایسی کوئی کمی نہیں کہ ماما آپ کو چھوڑ دیتیں۔“

ان کے جانے کے بعد وہ کافی دیر تک انہیں کے بارے میں سوچتی رہی۔



سعد کی فیملی نے امریکہ میں مستقل رہائش اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ یہ بات سنتے ہی پریشان ہو گئی تھی۔ ان کے لیے وہاں سیٹل ہونا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ آئی اور انکل دونوں کے بہن بھائی سالہا سال سے وہیں مختلف ریاستوں میں مقیم تھے۔ خود سعد اور زویب کی پیدائش بھی امریکہ کی تھی۔ سعد اور

زویب کی ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی تھی۔ سعد آٹھ سال کا تھا جب آنٹی انکل یا کستان آ گئے تھے اب ایک مرتبہ پھر انہوں نے واپس واپس چلے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

شروع شروع میں جب اس کے کانوں میں اس بات کی بھٹک پڑی تو اس نے زیادہ نوٹس نہیں لی۔ پچھلے دو تین سالوں میں وہ تین مرتبہ الیٹو اٹھتا اور پھر ختم ہوتا دیکھ چکی تھی لیکن حساس باختر تو وہ تب ہی جب اب کی بار اس نے الیٹو کو دینے کے بجائے عملی جامہ پہننے دیکھا۔ اگرچہ سعد نے آنٹی انکل کے ساتھ جانے کے لیے منع کر دیا تھا لیکن اپنی فیملی کے بغیر اکیلا یہاں پر کب تک رو سکتا تھا۔ اس کا ایم بی اے کم ہو جائے گا تو پھر وہ بھی وہیں جانے کی کرے گا۔ سعد نے اس کے شکوک و شبہات کے جواب میں سنجیدہ سے کہا تھا۔

”نی الحال تو میں کہیں نہیں جا رہا ہوں جب جانے لگوں گا تب تم رونا دھونا مچا لینا۔“ اس نے یہ لہجہ ہرگز نہیں دلایا تھا کہ وہ ہمیشہ یہیں رہے گا اور وہ ابھی سے آنے والے وقت کو سوچ کر رو رہی تھی جب اس نے آنٹی انکل کے پاس امریکہ چلا جائے گا۔ زویب جانے پر بہت خوش تھا۔ وہاں جا کر کسی اچھی یونیورسٹی میں بہترین تعلیم اور اعلیٰ ترین ڈگری حاصل کرنے کا سوچ کر ہی وہ مسرور تھا۔ آنٹی سعد کے ساتھ جانے پر بہت ناراض تھیں۔

”اگر سعد چل رہا ہوتا تو ہمارا ارادہ تھا کہ گھر کرائے پر دے دیں گے۔ وطن سے رابطہ قائم رہنا چاہیے گئے۔ بہن بھائی ہم دونوں میاں بیوی کے یہاں نہیں ہیں۔ لیکن پھر بھی کبھی وطن کی کشش کھینچے گی تو آکر گئے تو سہی۔ یہی سوچ کر گھر فروخت نہ کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ دیکھیں سعد شاید ایم بی اے کر کے واپس ہمارے پاس آ جائے پھر گھر کرائے پر دے دیں گے۔ ابھی تو سب کچھ یونہی چھوڑ کر جا رہے ہیں۔“

آنٹی انکل جانے سے پہلے ان لوگوں کے گھر نانا اور نانی امی سے ملنے آئے تھے۔ تب آنٹی نے بات نانی امی سے کہی تھی۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد اسے ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا کہ کسی روز سعد اچانک اسے اپنے لارڈ اینجلس جانے کی اطلاع دے گا اور وہ خاموش کھڑی روتے ہوئے اسے جاتا دیکھتی رہ جائے گی۔

گھر والوں کے جانے کے بعد اسے بوریٹ زیادہ ہی تنگ کرتی تو وہ ان لوگوں کے گھر آ جایا کرتا۔ نانا امی کا تو وہ شروع سے فیورٹ تھا۔ اب وہ اس کے کھانے پینے کا زیادہ ہی دھیان رکھنے لگی تھیں۔ جب بھی کوئی خاص ڈش بنتی فوراً فریا کو حکم دیا جاتا کہ سعد کو بھی فون کر کے بلا لو۔ یونیورسٹی جانے کے لیے

اللہ نے کی ڈیوٹی اس نے فریاء کے سپرد کی تھی۔

”مچی کی ڈانٹوں کے بغیر اٹھنے کی عادت ہی نہیں ہے۔ وہ سر پر کھڑی ہو کر چیخ چیخ کر اٹھاتی تھیں تب ہی اٹھتا تھا۔ الارم تو مجھ پر کوئی اثر کرتا ہی نہیں ہے۔ فخر و سے کہہ کر بھی دیکھ لیا کہ بھائی صبح جگا دیا کرو لیکن ارموصوف خود مچی کے جانے کے بعد آزادی کے مزے لے رہے ہیں۔ اب انہیں تو کسی یونیورسٹی، کالج یا نا نہیں جوتا لہذا عیش ہیں ان کے۔ مصیبت تو میری ہے۔ روز انسٹی ٹیوٹ لیٹ پہنچ رہا ہوں۔ تم پلیز فون کر دیا کرو اور قتل ہونے دیا کرو اس وقت تک جب تک کہ میں تنگ آ کر فون اٹھانہ لوں۔“

اسے صبح اٹھنے میں کبھی کوئی مشکل نہیں ہوتی تھی۔ نانا بابا اور نانی امی سے اس نے صبح خیزی سیکھی تھی۔ اسی لیے اس نے بڑے اطمینان سے یہ ذمہ داری قبول کر لی تھی اس کے ڈھیٹ پن کو ذہن میں رکھتے ہوئے وہ ایک ہی وقت میں اس کے موبائل اور گھر کے فون پر نمبر ملایا کرتی تھی۔ ایک ہاتھ میں موبائل اور دوسرے میں کارڈ لیس لیے وہ اس کی ڈھٹائی کو کوئی فون اٹھائے جانے کا انتظار کرتی پھر جیسے ہی وہ نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہتا۔

”اٹھ گیا ہوں میں۔ گھڑی بھی دیکھ لی ہے۔ پاکستان اسٹینڈرڈ ٹائم صبح کے ساڑھے سات بج رہے ہیں۔“

تو وہ اسے یہ نصیحت کر کے کہ ”اب دوبارہ سو مت جانا۔“ فون بند کر دیا کرتی۔ اس کی بدولت اب وہ جلدی تیار ہونے اور اپنے انسٹی ٹیوٹ پہنچنے لگا تھا۔ اس میں اس کے پاس اتنا نام نکلنے لگا تھا کہ وہ اسے لینے کے لیے آ جاتا۔ اکثر اب وہ یونیورسٹی سعد ہی کے ساتھ جاتی تھی۔ کسی دن وہ لینے کے لیے جلدی پہنچ جاتا اور وہ ابھی تیار نہ ہوئی ہوتی تو وہ اندر آ جاتا۔ نانی امی اسے زبردستی ناشتے کی میز پر بٹھا لیتیں۔

”میں ناشتہ کر کے آیا ہوں نانی امی۔“ وہ انہیں یقین دلاتا۔

”ارے ماں یہاں نہیں ہے۔ نوکر دن نے کیا ناشتہ کرایا ہوگا۔ یہ سوچی میدے کے پرانھے بنائے ہیں میں نے۔ ذرا سا چکھ لو۔“ ان کے محبت بھرے اصرار پر وہ پچھنے کے بجائے پورا پراٹھا ہی کھانے بیٹھ جاتا۔

”آپ بلاوجہ اس کی فکر کر رہی ہیں ناشتہ تو اس نے کبھی زندگی میں کیا ہی نہیں ہے۔ ہر روز آٹلی سے اس بات پر ڈانٹ کھا کر اسکول کالج اور پھر یونیورسٹی جاتا تھا کہ تھوڑا جلدی اٹھ جاتے تو یہ بھاگ دوڑ تو نہ چتی۔ کم از کم سکون سے ناشتہ تو کر لیتے۔ یہ تو میری بدولت اسے ناشتہ کرنے ڈھنگ سے تیار ہونے اور

صبح کے سہانے منظر کو اٹھاتے کرنے کا موقع ملنے لگا ہے۔“

وہ اپنا بیگ اور فائل ٹیبل پر سے اٹھاتے ہوئے کہتی۔ سعد جو باہر سے غصے سے گھورتا۔ کبھی سمجھا رہا ہے کہ آجانی اور ناشتے کے لیے بیٹھ جانے پر سعد کی نانا ابا کے ساتھ اخبار کی کسی خاص خبر یا کسی اہم واقعہ بارے میں گفتگو بھی ہو جایا کرتی تھی۔

نانا امی کے برخلاف اس کی نانا ابا سے بالکل بھی بے تکلفی نہیں تھی اور بہت سے لوگوں کی طرح وہ ان سے کچھ خائف رہا کرتا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی سوردب ہو کر سنبھل سنبھل کر بات کرنے لگتا تھا۔ قریباً نانی امی اس کے شریفانہ انداز اور محتاط طرز گفتگو پر زیر لب مسکرایا کرتیں۔ نانی امی سے تو وہ اس درجہ تکلف تھا کہ بڑی ڈھنمائی اور بے شرمی سے انہیں کے سامنے فریاد کر یہ بات بتائی تھی کہ آج کل اس کمپیوٹر کے ڈیسک ٹاپ پر جو لیڈر ابرٹس کی جگہ ایسا کورٹیکو نے لے لی ہے۔

جیسے ہی سعد امتحانوں سے فارغ ہوا اس نے آئی انٹل کے پاس بھاگنے کی کی۔ وہ خاموشی سے ا کے جانے کی تیاریاں دیکھ رہی تھی۔ اس کا ایم بی اے مکمل ہو چکا تھا۔ اب یہاں رہنے کا جواز ہی کیا تھا اگر وہ رہنے کے ارادے سے جا نہیں بھی رہا تھا لیکن وہاں جا کر اس کا ارادہ بدل بھی تو سکتا تھا۔ حالانکہ جب وہ خدا حافظ کہنے آیا تو نانا ابا کے استفسار کے جواب میں اس نے یہی کہا تھا کہ ایک دو ماہ میں واپس آ جائے گا۔ اس کا پاکستان چھوڑ کر کہیں اور سٹل ہونے کا ارادہ نہیں۔ واپس آ کر وہ ہمیں کسی چاچا باب کے لیے ایلانی کرے گا لیکن جب ان کے پاس وہاں کی شہریت تھی اس کے ماں باپ اور بھائی بھی وہیں تھے تو اسے یہاں واپس آنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

”میں واپس آؤں گا فری۔“ وہ گیٹ تک اسے چھوڑنے آئی تو گیٹ کے پاس رک کر براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے یہ بات کہی۔ وہ اس کی بات پر گڑبڑا گئی۔ وہ اس کی جس عادت سے جڑتا تھا وہ ہر بار اسی کا ارتکاب کرتی اس کے ہاتھوں پکڑی جاتی تھی۔

”مجھے پتا ہے کہ تم واپس آؤ گے۔“ اس نے اسے جھٹلانے کے لیے مصنوعی اعتماد کا سہارا لیا تھا۔

”پتا تو ہے تمہیں لیکن یقین نہیں ہے اور یہ یقین میں کیسے دلاؤں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ یار! میز یہاں سے کیوں جاؤں گا۔ مجھے یہاں کیا تکلیف ہے۔ ٹھیک ہے بہت زیادہ محبت وطن میں نہیں ہو رہی لیکن اگر اپنے ہی ملک میں انسان صحیح سے سیٹ ہو۔ جا ب وغیرہ بھی ٹھیک ہوتو پھر کسی دوسرے ملک میں رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس معاملے میں تم مجھے قناعت پسند کہہ لو۔ میں پاکستان سے کہیں نہیں جاؤں۔“

دہ بڑی بردباری سے اسے اپنی واپسی کا یقین دلارہا تھا۔ اس سے پہلے بھی کتنی مرتبہ وہ چھٹیوں میں امریکہ جاتا تھا تب بھی دل کو یہ دھڑکانیں لگا تھا کہ وہ واپس نہیں آئے گا۔ اس بار یہ خوف بڑی شدت سے دل میں جاگا تھا۔ لیکن جب اس نے اتنے مستحکم دو ٹوک انداز میں واپس آنے کا کہا تو اس نے یقین کر لیا تھا اور اس کا یہ یقین غلط بھی نہیں ثابت ہوا تھا۔ وہ واقعی چھٹیاں گزار کر واپس آ گیا تھا۔

اس نے جاب کے لیے اپلائی کیا اور یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے بہت بہترین جاب وہ بھی اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر مل گئی تھی۔ بہت مشکل تحریری امتحان اور انتہائی سخت قسم کے انٹرویو کے مراحل سے گزرنے کے بعد اسے اپنی من پسند جاب ملی تھی۔ اس کی جاب پر فرمایا اس سے زیادہ خوش تھی۔ اس نے سعد کی کامیابی کے لیے بہت ساری دعائیں مانگی تھیں۔ اس کی ذہانت اور اس کی صلاحیتوں پر تو اسے کوئی شبہ نہیں تھا لیکن یہ بھی معلوم تھا کہ یہاں اکثر ذہانت، صلاحیت اور اہلیے رکھنے والوں کو پیچھے دھکیل کر نابل اور ناکارہ لوگوں کو آگے کر دیا جاتا ہے۔ وہ اس بات سے ڈر رہی تھی لیکن شکر تھا کہ سعد کے معاملے میں ایسا کچھ نہیں ہوا۔



وہ لاؤنچ میں بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔ جب فون کی بیل بجی تھی۔ دوسری طرف سے آتی حمزہ کی آواز وہ فوری طور پر پہچان نہیں پاتی تھی اس کے تعارف کروانے پر ہی وہ پہچانی تھی۔

”بہت لمبی عمر ہے تمہاری۔ میں ابھی تمہارا آرٹیکل پڑھتے ہوئے تمہارے ہی بارے میں سوچ رہی تھی۔“ اس نے بے ساختہ کہا۔

”کیا سوچ رہی تھیں؟“ اس نے لمبی عمر اور آرٹیکل کی بات چھوڑ کر سوچنے کے بارے میں پوچھا۔

”بس یہی کہ تم بہت اچھا لکھتے ہو۔ پتا نہیں کون سا وقت ہوگا جب میں تمہاری طرح لکھ سکوں گی۔ اتنا اپ ٹو ڈیٹ اور اس قدر مکمل معلومات۔ تمہارا لکھا کچھ بھی پڑھوں تو یہی احساس ہوتا ہے کہ اس کے پیچھے بہت سی محنت اور ڈیڑھ ساری ریسرچ کا فرما ہے۔“ وہ اس کے تبصرے پر مسکرایا۔

”تعریف کا بہت بہت شکریہ۔ ویسے تمہاری یہ عادت بہت اچھی ہے تم تعریف کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتیں۔ درنہ اکثر لوگوں کو دوسروں کی تعریف کرنا بہت مشکل لگتا ہے یوں جیسے تعریف کرنے سے ان کا کچھ خرچ ہو جائے گا۔“ اس نے کچھ دل جملے انداز میں کہا پھر خود ہی بات بدلتے ہوئے بولا۔

”یہ سب باتیں تو انا، اللہ تعالیٰ سے ہوں گی۔ اس وقت تو میں نے یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ میں کراچی آ رہا ہوں۔ ایک... انو... ہنسی گئی نیوز اسٹوری پر کام کر رہا ہوں۔ اسی سلسلے میں آتا ہے۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے کب آ رہے ہو۔“ اس نے پرخص امتیاز میں پوچھا تو اس نے جوہا کہا۔

”بس تم تیار ہو میری میزبانی کے لیے۔ ایک دو روز میں نازل ہونے والا ہوں۔“

فون بند کر کے اس نے فوری طور پر یہ بات ثانی امی کو بتائی۔ حمزہ نے ایک دو روز کہا تھا اور یہ ایک دو روز تین چار روز میں تبدیل ہو سکتے تھے لیکن حیرت تو اسے تب ہوئی جب اگلے روز صبح اسے اپنے گھر میں دیکھا۔ وہ اس کی حیرت کو انجوائے کرتا ہوا مسکرایا۔

”میں نے سوچا کیا حرج ہے اگر میں آج ہی آ کر سر پرائز دے دوں ورنہ میرا ارادہ کھل آنے کا تھا۔ تم سے بات کرنے کے بعد میں نے پروگرام میں تبدیلی کر لی۔ آئی ہو پیر آنا ایک اچانک رہنما ہونے والا خوشگوار واقعہ سمجھا گیا ہوگا۔“ اس کے شریک سے انداز پر اس نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔

نانا ابا حمزہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے۔ وہ ان کی گڈ بکس میں تھا۔ اس کی سنجیدگی، متانت اور اپنے پروفیشن سے لگن انہیں بے حد پسند تھی۔ آج کل کے نوجوانوں کی غیر ذمہ داری اور لاابالی پن سے وہ سخت شاک کی رہتے تھے۔ نوجوانوں کی تن آسانی اور بھل پسندی کا انہیں بے حد شکوہ تھا۔ جہاں ڈگریاں اس لیے حاصل کی جاتی ہیں کہ ان کے ذریعے شاندار ملازمت حاصل کی جاسکے۔ یا پھر امریکہ یا کینیڈا ایگریگیشن کے لیے پوائنٹس بڑھائے جاسکیں۔ ایسے میں حمزہ جیسے نئی نسل کے لوگ جو محنت اور جدوجہد پر یقین رکھتے ہوں۔ جن کے نظریات ٹھوس اور سوچ پختہ ہو اور جو اپنی زندگی کے بارے میں بہت واضح اور درست لائحہ عمل رکھتے ہوں انہیں بے حد پسند تھے۔

حمزہ نے ماسٹرز کے بعد ایک بہت اچھی ریپوزیشن اور سرکولیشن کے حامل تیوز پیپر کو جوائن کر لیا تھا۔ اپنے اخبار کی بلکہ کسی اور کو جوائن کرنے کی اس کے پاس یہ توجیہ تھی کہ یہاں وہ ملازم کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔ کسی کا تنخواہ دار ہے۔ ہر لمحہ جواب طلبی کا خطرہ بھی موجود رہتا ہے۔ جبکہ وہاں کام کرنے میں چونکہ اس کے اندر مالکانہ انداز نہ چاہتے ہوئے بھی خود بخود آ جاتا ایسے میں وہ اس درجہ محنت اور لگن کا مظاہرہ نہ کرتا جتنا یہاں کر رہا تھا۔

اپنے ایڈیٹر اور دونوں بچاؤں کے بڑی محنت سے اسٹیبلش کیے ہوئے اخبار میں جس کی اپنی بہت اچھی ریپوزیشن تھی۔ بہت اچھی سرکولیشن تھی۔ اس میں فی الحال وہ شمولیت اختیار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے

گلتا تھا، ہاں جا کر وہ سوائے ماکا نہ انداز میں بیٹھے بیٹھے حکم چلانے کے کوئی تخلیقی کام نہیں کر سکے گا۔ جبکہ یہ دقت تو سیکھنے اور کام کرنے کا تھا۔ یہی سکھنا اور کام کرنا تو پھر آگے جا کر اس کے کام آنا تھا۔ ان خیالات کی بدولت اگر وہ مانا یا کواچھا گلتا تھا تو کچھ تعجب کی بات نہیں تھی۔

’ناشتہ تو میں کر چکا ہوں۔ چلیں آپ لوگوں کے ساتھ چائے پی لیتا ہوں۔‘

نانی امی نے حمزہ سے ناشتے کے لیے کہا تو وہ جواب دیتا ہوا ان لوگوں کے پاس ڈائنگ ٹیبل پر آ کر بیٹھ گیا۔ نانا اب اس سے اس کے تازہ ترین اسائنمنٹ کے بارے میں پوچھنے لگے۔ وہ بڑی سنجیدگی سے انہیں اپنے کام کے بارے میں بتا رہا تھا۔ فریابھی دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ ناشتہ ختم کر کے وہ کھڑی ہوئی تو حمزہ کو مخاطب کر کے بولی۔

’آج جانا ضروری نہ ہوتا تو میں چھٹی کر لیتی۔‘ وہ یونیورسٹی کے لیے لیٹ ہو رہی تھی لیکن مہمان کے آتے ہی ایک دم اٹھ کر چلے جانا بھی اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ حمزہ اس کے قابل انداز اور اخلاقیات کے اس مظاہرے پر جیسی ہی ہنسی ہنسا۔

’میں اتنا بڑا لارڈ تو نہیں کہ میرے آنے پر لوگ اپنے اپنے کاروبار زندگی چھوڑ کر گھر بیٹھ جائیں۔ نہ ہی میں کوئی مہمان ہوں۔ تم آرام سے یونیورسٹی جاؤ۔ اس وقت تو میں خود بھی اپنے آفیشل کام سے آیا ہوا ہوں۔ تھوڑی دیر میں میں بھی گھر سے چلا جاؤں گا۔ لیکن اگر صرف گھومنے پھرنے یا چھٹیاں انجوائے کرنے آیا ہوتا تب بھی اس چیز کو پسند نہ کرتا کہ تم میری وجہ سے اپنا روٹین چنچ کر دو۔‘

نانا اب اور نانی امی ان دونوں کی گفتگو کے دوران خاموشی سے چائے پیتے رہے تھے۔ وہ سر ہلاتی سب کو خدا حافظ کہتی باہر نکل گئی۔

حمزہ سے پھر اس کی ملاقات رات کے کھانے پر ہوئی تھی۔ نانی امی نے بتایا تھا کہ وہ صبح گیارہ بجے کا گھر سے نکلا ہوا تھا اور یہ بات کہہ کر گیا تھا کہ اس کی واپسی کا کوئی فکس ٹائم نہیں ہے لہذا کھانے پر اس کا ہرگز انتظار نہ کیا جائے۔ وہ لوگ کھانا شروع کر چکے تھے جب حمزہ آیا تھا۔

’صحیح وقت پر آ گیا میں۔‘ وہ جلدی سے ہاتھ دھو کر ان لوگوں کے ساتھ شریک طعام ہو گیا۔

’میں نے کچھ خاص اہتمام بھی نہیں کیا۔ تمہارا پکا پتا ہی نہیں تھا کہ کھانا گھر پر کھاؤ گے کہ نہیں۔ فری کہنے لگی۔ فضول میں کیوں محنت کر رہی ہیں۔ جس روز حمزہ کا لنچ یا ڈنر گھر پر کرنے کا کنفرم ہو اس روز اہتمام کر لیجئے گا۔‘ نانی امی نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

”میں بڑا سیدھا سارا سا بندہ ہوں بڑی امی اور کھانے پینے کا زیادہ شوقین بھی نہیں ہوں۔ یقین کریں اس وقت میرے پر جو جو شیز موجود ہیں میرے حساب سے تو یہ بھی بہت زیادہ ہیں اور اس عمر میں آپ سے بچو اگر ہاؤں آپ میری خاطر کریں۔ مجھے تو یہ بات بالکل اچھی نہیں لگے گی۔“

اس نے بڑی متانت سے ان کا افسوس رور کرنے کی کوشش کی۔ پھر کچھ سوچ کر وہ مسکرایا اور ایک نظر خاموشی سے کھانا کھاتی فریاء پر ڈال کر ان سے بولا۔

”ہاں اگر آپ فریاء سے میرے لیے اچھے اچھے دعوتی کھانے کھائیں تو پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ پھر اگر آپ روزانہ بھی میرے لیے خاص اہتمام کروائیں گی تو میں برا نہیں مانوں گا۔“

نانا بابا حمزہ کے شرارتی انداز پر بے ساختہ ہنس پڑے۔ نانی امی کے لبوں پر بھی مسکراہٹ تھی۔ وہ اس کی شرارت کے جواب میں فوراً بولی۔

”اہتمام تو مہمانوں کے لیے کیا جاتا ہے اور تم خود صبح اپنے آپ کو مہمانوں کی لسٹ سے نکلوا چکے ہو۔ دعوتی کھانے پکانے تو مجھے یوں بھی نہیں آتے۔ سیدھے سادے بندے کو سیدھی سادی پاکستانی ڈشز کھلا سکتی ہوں۔ مثلاً اس وقت میرے موجود ماش کی پھریری دال میں نے ہی پکائی ہے۔ کونفے البتہ نانی امی نے بنائے ہیں اور اس کے بعد سوئیٹ ڈش میں جو پڈنگ کھانے کو ملے گی وہ بھی میں نے ہی بنائی ہے۔“

حمزہ اس کے سیدھے سادے بندے کہنے پر کھل کر ہنسا تھا۔ کھانے کے بعد وہ سب لاؤنج میں بیٹھ گئے۔ فریاء سب کے لیے کافی بنا کر لائی تھی۔

”تمہاری پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟“ اس کے ہاتھ سے کپ لیتے ہوئے حمزہ نے پوچھا۔

”پڑھائی بالکل ٹھیک چل رہی ہے۔“ وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔

”صرف ٹھیک نہیں بلکہ انتہائی بہترین۔“ نانا بابا نے اس کا جواب سنتے ہی حمزہ سے کہا۔ ”آنرز کا آخری سمسٹر ہے اس کا اور پچھلے تمام سمسٹرز میں نہایت شاندار مارکس لیے ہیں اس نے۔“

نواسی صاحبہ کرسٹینا سے کام لینے کے موڈ میں تھیں لیکن نانا بابا نے اس کی اس کوشش پر پانی پھیر دیا۔ وہ ان کی تعریف پر بجائے فخر سے سر ادنچا کرنے کے سر جھکا کر کافی پینے لگی۔

”ہر سمسٹر میں اپنی کلاس میں فرسٹ پوزیشن لی ہے فری نے۔“ نانا بابا تعریفوں کے پل یا تھنے میں مصروف تھے۔ حمزہ ان کی تعریفوں سے زیادہ ایک پیریشنز کو انجوائے کر رہا تھا۔ وہ اس طرح لا پرواہی سے سر

جھکائے کانی پینے میں مصروف تھی جیسے یہ کسی اور کے بارے میں بات ہو رہی ہو اور اس بات سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

لوگ بغیر کوئی تاہیل ذکر کا نامہ سرانجام دیے میاں مٹھوئے پھرتے ہیں اور وہ اپنی بالکل جائز تعریف پر بھی شرمندہ سی مٹھی ہوئی تھی۔ حمزہ کو اس کا یہ انداز بہت اچھا لگا تھا۔



حمزہ کو آئے چار دن ہو گئے تھے اور اس دوران اس کی حمزہ سے بہت کم ملاقات ہو پائی تھی۔ صبح وہ یونیورسٹی جاتی تو دوسرا ہوا ہوتا اور رات گئے جب وہ واپس آتا تو وہ سوچکی ہوتی۔ اس کی اپنے کام کے ساتھ جس قسم کی کمٹمنٹ تھی ایسے میں ان تینوں میں سے کوئی بھی اس کے اس شیڈول اور روٹین کا برا نہیں مان رہا تھا۔ وہ یہاں کام سے آیا تھا اور کام بھی ایسا جو بہت محنت طلب اور پوری توجہ کا متقاضی تھا۔ نانی امی کو بھی اس نے اپنے لیے جانے اور انتظار کرنے سے منع کر دیا تھا۔ یہ اور بات کہ جب تک وہ آ نہیں جاتا نانا اور نانی امی اپنے کمرے میں اس کی واپسی کا انتظار کرتے رہتے تھے۔

اس روز شام میں وہ اور نانی امی لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھیں جب حمزہ گھر آیا تھا۔

”میں سوچ رہا تھا اس طرح تو میرے جانے کا وقت آ جائے گا۔ فریاء سے تو بالکل ملاقات ہی نہیں ہو پارہی۔ اسی لیے آج جلدی واپس آ گیا۔ بڑے ابا اور بڑی امی سے تو روزانہ صبح میں تفصیلی ملاقات ہو جاتی ہے۔ گیارہ بارہ بجے تک تو میں گھر پر ہی ہوتا ہوں۔“

سلام دعا کے فوراً بعد اس نے کسی استفسار کے بغیر خود ہی اپنی جلدی واپسی کا سبب بتا دیا۔

”پھر تو مجھے شکر یہ ادا کرنا چاہیے کہ آپ نے میرے لیے اپنی اتنی بے شمار مصروفیات میں سے وقت نکالا ہے۔“ اس نے احساندی کا مصنوعی قسم کا مظاہرہ کیا۔

”تمہارے لیے نہیں تم سے ملنے کے لیے۔“ حمزہ نے تصحیح کرنی ضروری سمجھی۔

”کیا فرق پڑتا ہے بات تو ایک ہی ہے۔“ اس نے لاپرواہی سے کہا۔ حمزہ جو اب مسکراتے ہوئے خاموش ہو گیا تھا لیکن اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ان دونوں باتوں میں بہت فرق سمجھتا ہے۔ نانی امی نے اس سے حمزہ کے لیے چائے لانے کو کہا تو اس نے چائے کے لیے منع کر دیا۔

’چائے کا میرا کچھ خاص بیوڈ نہیں۔ البتہ کہیں باہر جانے کے موڈ میں ضرور ہوں۔ تم نے تو مجھے کراچی میں کوئی بھی جگہ نہیں دکھائی۔ بڑی بے مروت ہو۔ کبھی ہمارے ہاں آنا پھر دیکھنا ہم تمہیں کس طرح

پورے شہر کی سیر کروائیں گے۔“

وہ فریاد سے مخاطب تھا۔ وہ اس کے شکوہ کے جواب میں اسے اس کی عہدیم انحرصتی کے حوالے سے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن وہ اس سے پہلے ہی دوبارہ بول پڑا۔

”ہاں روزانہ میں خود بھی گھر پر نہیں ہوتا ہوں لیکن آج گھر پر بھی ہوں اور قراغ بھی ہوں۔“
اسے جواب دے کر وہ ثانی امی سے اجازت لینے لگا۔ ”کیوں بڑی امی ہم لوگ کہیں باہر جاسکتے ہیں؟“

انہوں نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلادیا۔ وہ دونوں پورچ میں آئے تو گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے وہ حمزہ سے بولی۔

”چار دن سے تم سارا سارا دن شہر کی خاک چھان رہے ہو۔ ابھی بھی کراچی گھومنے کا شوق پورا نہیں ہوا۔“

”تمہارے اس سوال کا جواب میں ابھی دیتا ہوں لیکن پہلے ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں۔“ وہ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے دوسری طرف کا دروازہ کھول چکی تھی۔ اس بات پر اس نے سوالیہ نظروں سے حمزہ کو دیکھا تھا۔

”اگرچہ کہ یہاں میزبان تم اور مہمان میں ہوں مجھے یہاں کے راستوں کا بھی تم سے بہتر علم نہیں ہو سکتا۔ لیکن پھر بھی اگر تم ماسڈ نہ کرو تو گاڑی مجھے ڈرائیو کرنے دو۔ اس بات پر تم چاہے مجھے بہت روایتی قسم کا تنگ نظر مرد ہی کیوں نہ سمجھو لیکن میری موجودگی میں اگر تم نے ڈرائیو کیا تو میری مردانہ بہت ہرٹ ہوگی۔ یار! بہت پڑھ لکھ کر بھی ہم بعض معاملات میں عورتوں کو خود سے پیچھے دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ نام نہاد مردانہ حاکمیت اور کچھ کچھ انا کا مسئلہ ہے۔“

وہ ڈرائیونگ سیٹ کے پاس کھڑا اپنی تنگ نظری اور محدود ذہنیت کا اتنے مزے سے اعتراف کر رہا تھا کہ وہ ایک پل کے لیے حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی۔ وہ اتنی لمبی تقریر کے بغیر بھی اگر صرف یہی کہہ دیتا کہ گاڑی مجھے ڈرائیو کرنے دو تب بھی بات تو اس کی سمجھ میں آتی جاتی لیکن وہ اپنی روایتی سوچ کا اپنے منہ سے اعتراف کر کے اسے پنپنے پر مجبور کر گیا تھا۔ بغیر کچھ کہے وہ ہنستے ہوئے گاڑی سے اتر گئی۔ اس کے اترتے ہی وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ برابر والی سیٹ پر بیٹھی تو اس نے گاڑی اشارت کر دی۔

’ہاں اب تمہارے سوال کا جواب۔“ گاڑی ریورس کرتا ہوا وہ بولا۔ ”کام سے باہر جانے میں بہت قرتی ہے۔ اس وقت میرا ذہن بالکل فارغ اور تفریح کے موڈ میں ہے۔ اس وقت میں ہر چیز کو انجوائے کر رہا ہوں۔ کام سے مختلف جگہوں پر جانے کے دوران میرا ذہن مصروف ہوتا ہے۔“

وہ اس کی طرف گردن موڑے اس کا جواب سن رہی تھی۔ گاڑی ٹرن کرتے ہی سعد اپنی گاڑی میں نظر آیا۔

’یہ سعد تھانا۔“ وہ حمزہ کی اتنی اچھی یادداشت پر حیران ہوئی۔ صرف ایک دفعہ اس سے مل کر اسے وہ نام کے ساتھ یاد تھا۔ سعد نے بھی ان لوگوں کو دیکھ لیا تھا۔ اس کے ”ہاں“ کہنے پر حمزہ نے گاڑی سائیڈ میں روک لی تھی۔ اسے گاڑی روکتے دیکھ کر سعد نے بھی گاڑی روکی اور پھر ریورس کر کے ان لوگوں کی طرف آ گیا تو حمزہ گاڑی سے فوراً اتر گیا تھا۔ اسے سعد کے ساتھ اس قسم کے میمز برتنے کی قطعاً ضرورت نہ تھی اس لیے بیٹھے بیٹھے ہاتھ ہلاتا تھا اور اب اطمینان سے ان لوگوں کی رسمی گفتگو سننے لگی تھی۔

حمزہ نے اسے اپنی کراچی آمد کی وجہ مختصر الفاظ میں بتائی اور جواب میں سعد نے اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دی تھی۔ سعد کی گفتگو کا انداز بہت رسمی سا تھا، اتنا زیادہ قابل طریقے سے بات کرنا اس کا اسٹائل نہیں تھا۔ وہ اس کے پوز کرنے پر دل ہی دل میں ہنسی تھی۔ وہ یقیناً آفس سے واپس آ رہا تھا۔ بلیک پیٹ، بلیو شرٹ اور بلیو ٹائی میں وہ بہت زبردست لگ رہا تھا۔ برابر والی سیٹ پر رکھا بلیک کوٹ بھی اسے صاف نظر آ رہا تھا۔ لباس کے معاملے میں وہ سدا کالا پروا تھا۔ جینز اور ٹی شرٹ کے علاوہ اس نے اسے کبھی کسی اور لباس میں نہ دیکھا تھا۔ ایسے میں یہ مہذبانہ اور بڑی توجہ سے کی گئی تیاری اسے بہت مختلف اور سو برس سا ظاہر کر رہی تھی۔

’اس کی کوئیگز تو ضرور اس پر فدا ہوتی ہوں گی۔ انہیں تو یہ خوب ہی پینڈم لگتا ہوگا۔“ وہ دل میں یہ سوچتی کہ سعد سے اکیلے میں بات ہوگی تو ضرور پوچھے گی کہ آفس میں کتنی لڑکیاں اس ڈریسنگ اور اسٹائل پر فدا ہوتی ہیں۔ ان لوگوں کو آفس میں ہاتھ ملاتے اور خدا حافظ کہتے دیکھتی رہی۔ حمزہ واپس گاڑی میں بیٹھا تو وہ اپنی سوچوں سے باہر نکلی۔ کچھ دیر وہ اس سے سعد کی جاب کے بارے میں بات کرتا رہا۔

’کسی قابل بندے کو اس کی قابلیت کے حساب سے درست جگہ پر دیکھو تو بہت خوشی ہوتی ہے۔ اور ہمارے ہاں اس قسم کی خوشی کے مواقع بڑے کم میسر آتے ہیں۔“

وہ اپنے خیالات کا بڑی سنجیدگی سے اظہار کر رہا تھا۔ موسم بہت خوشگوار تھا ایسے موسم میں سی ویو آنا مزید

اچھا لگ رہا تھا۔

”میں نے تمہارا آرٹیکل پڑھا تھا۔ اچھا لکھا ہے تم نے۔“ دیتیز ہوا میں جبر سے پر آئی لٹوں کو ہاتھ سے پیچھے کر رہی تھی۔ جب اس کے ساتھ چلتے ہوئے حمزہ نے یہ بات کہی۔

اس سے اپنے آرٹیکل کا ذکر سن کر وہ خوش ہوئی تھی۔ جس اخبار میں اپنا لکھا ہوا چھپانے کا اسے کان عرصے سے شوق تھا اس میں اپنا آرٹیکل چھپ جانے پر وہ بے حد خوش تھی۔ اس سے پہلے اس کے تین چار آرٹیکلز چھپنے موٹے میگزینز اور نیٹا کم سرکولیشن والے اخباروں میں چھپ چکے تھے لیکن اس کی شدید خواہش کسی لیڈنگ نیوز پیپر میں چھپنے کی تھی اور اس کی یہ خواہش آخر پوری ہوئی گئی تھی۔ اس اخبار کا نوجوانوں کے لیے جو نیکی میگزین شائع ہوتا تھا اس میں اس کا آرٹیکل چھپا تھا۔

”ویسے تو کوئی نہ بھی بتاتا تب بھی تمہارا آرٹیکل میری نظروں سے ضرور گزرتا۔ لیکن کل میرے اخبار دیکھنے سے پہلے ہی بڑے ابا نے مجھے تمہارے آرٹیکل کے بارے میں بتایا۔ پھر تو میں نے سارا اخبار ایک طرف رکھ کر تمہارا آرٹیکل پڑھا تھا۔“ اس کے ساتھ ٹپکتے ہوئے وہ گویا ہوا۔

”بہت شوق تھا مجھے اپنی کوئی تحریر یہاں چھپوانے کا۔ میرا بہت دل چاہتا تھا کہ جو اخبار بچپن میں اپنے گھر آتے دیکھ رہی ہوں اور اس میں لکھنے والے تمام لوگ مجھے بڑے جانے پہچانے سے لگتے ہیں ان کے درمیان میں اپنا نام بھی شائع ہوتا دیکھوں لیکن یہ بڑے اخباروں کے نخرے بھی بڑے ہوتے ہیں۔ ہم جیسے نوجوان صحافت کے طالب علموں کو یہ لوگ ذرا کم ہی لگتے کرواتے ہیں۔ میرے کتنے کلاس فیلوز تو اپنے اپنے آرٹیکلز بھیجنے کے بعد مہینوں سے چھپنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں تو پھر بھی خوش قسمت ہوں کہ پہلی مرتبہ کچھ بھیجا اور وہ جہلش بھی ہو گیا۔ حالانکہ میں اتنا ڈر رہی تھی۔“

حمزہ اس کی بات بہت توجہ سے سن رہا تھا۔

”ویسے تم اپنے کمنٹس دو میرے انداز تحریر کے بارے میں۔ بے شک تنقید کرو میں ہرگز برا نہیں مانوں گی۔ ایسی تنقید جو اصلاح کے لیے کی جائے اسے میں بالکل برا نہیں سمجھتی۔“ وہ اب اپنے مضمون کی خوبیاں اور خامیاں جاننا چاہ رہی تھی۔ حمزہ کی ذہانت قابلیت اور پیشہ ورانہ مہارت سے تو وہ از حد متاثر تھی اس لیے اس کی رائے وہ ضرور جانا چاہتی تھی۔

”سوچ لو تم خود مجھے تنقید کی دعوت دے رہی ہو اور میری کی جانے والی تنقید سے ابھی تم واقف نہیں ہو۔ اگر میں نے اپنے مخصوص بے لاگ انداز میں تبصرہ اور تنقید کی تو تم ضرور ناراض ہو جاؤ گی۔“ وہ تنقید

لہذا عورت سنے پر مسکراتے ہوئے بولا۔

”کہہ تو رہی ہوں! میں ناراض نہیں ہوں گی۔“ اب تو وہ اس کا تبصرہ سننے پر اور بھی زیادہ مسرتھی۔ نانا بابا اردو دستوں نے تو اس کے لکھنے کی بہت تعریف کی تھی۔ لیکن حمزہ اس طرح کہہ رہا ہے تو اس کا مطلب ہے اس میں بہت سی چیزیں قابل تنقید ہیں۔ وہ دل میں سوچ رہی تھی۔ وہ اس کے چہرے پر پھیلے تجسس اور ٹوڑی سی اس بات کی ٹینشن کہ ابھی اس پر نہایت کڑی تنقید کی جانے والی ہے کو دیکھ کر زرب لب مسکرا دیا۔

”اگر یہ سوچ کر تمہارے آرٹیکل کو بیچ کر دوں کہ یہ تمہاری ابتدا ہے تو پھر مجھے اس میں کوئی بات تید کے قابل نظر نہیں آ رہی ہے پھر میں اسے اے پلس دوں گا۔ اور اگر اس بات کو ذہن سے نکال کر تمہاری تحریر کا تجزیہ کروں تو بعض باتوں پر مجھے شدید اختلاف ہے۔ بعض جگہ ایک ہی بات دو تین بار کہی گئی ہوئی لگتی ہوئی ہے۔ کہیں کہیں تم اپنے موضوع سے ہٹ بھی گئی ہو۔ لیکن اوور آل اگر میں تبصرہ کروں تو یہی کہوں گا کہ تم نے بہت اچھا لکھا ہے۔ اس سے اندازہ ہو رہا ہے کہ آگے تم کیا کیا کر گزرنے والی ہو۔“

کوئی کڑی تنقید نہ ہونے پر اس نے ایک گہری طمانیت بھری سانس لی۔

”ایک چیز اور نوٹ کی ہے میں نے تمہاری۔“ وہ مزید گویا ہوا تو وہ سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ”تم دل سے سوچتی ہو فریاء! وہ اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ وہ خاموشی سے اس کے مزید بولنے کی منتظر تھی۔

”ہر دہشت گرد مسلمان ہی کیوں ہوتا ہے۔“ تم نے اس موضوع پر بڑی حساسیت اور اپنی تمام تر سوچوں کو دل کے تابع کر کے لکھا ہے۔“

”کیا اس موضوع پر حساس ہونا اور دل سے سوچنا ناجائز ہے۔“ وہ اس کی بات سن کر بحث کرنے والے انداز میں پوچھنے لگی۔

”میں نے یہ نہیں کہا کہ یہ غلط ہے۔ دراصل لوگوں کی بنیادی طور پر دو اقسام ہیں۔ ایک وہ جو دماغ کو اولیت دیتے ہیں ہر کام عقل و شعور کی بنیاد پر کرنا پسند کرتے ہیں اور دوسرے تمہاری طرح کے جن کا دماغ اور تمام سوچیں دل کے تابع ہوتی ہیں۔ وہ سوچنے کا کام بھی دل سے ہی لیتے ہیں۔ ایسے لوگ بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ یعنی ذرا نادر و نایاب قسم کے۔ اور تم لوگوں کی اس نایاب بلکہ کمیاب کیلنگری سے تعلق رکھتی ہو۔ تم زندگی میں ہر وہ کام کرو گی جو تم سے تمہارا دل کرنے کو کہے گا اور دل کے اس کہے کے آگے تم اپنا کوئی نفع نقصان اور کسی عقل و دانش کو قبول نہیں کرو گی۔“

صرف ایک آرٹیکل پڑھ کر وہ اس کی پوری شخصیت کا تجربہ کرنے لگا تھا۔ اپنے بارے میں یہ بات اسے خود نہیں معلوم تھی، اس لیے اس نے اس بارے میں مزید بحث یا اختلاف نہیں کیا۔ لیکن ایک بات اس نے حزرہ سے ضرور پوچھی۔

”شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ہو سکتا ہے یہ سچ ہو کہ میں دل سے سوچتی ہوں لیکن حزرہ! کیا دل سے سوچنا بری بات ہے۔ جو لوگ دل کی مانتے ہیں کیا وہ کم عقل اور بے وقوف ہوتے ہیں۔ ہمیشہ نقصان اٹھاتے ہیں؟“ اس کی بے حد سنجیدگی سے پوچھی گئی بات کے جواب میں وہ بڑے مضبوط لہجے میں فوراً بولا۔

”اوروں کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن تمہارے بارے میں یہ بات ہنڈرڈ پرسنٹ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تمہارا دل تمہیں کبھی کوئی غلط مشورہ نہیں دے گا۔ مجھے یقین ہے کہ دل سے سوچنے کے باوجود بھی تم کبھی نقصان نہیں اٹھاؤ گی۔“

”صرف ایک آرٹیکل پڑھ کر تم نے میرے بارے میں اتنے سارے اندازے لگا لیے۔ میں حیران ہوں۔“ وہ متحیر سی بولی۔

”یہ صرف ایک آرٹیکل پڑھ کر لگائے جانے والے اندازے نہیں ہیں۔ پہلے بھی تمہارے بارے میں میری یہی رائے تھی اب تو اس رائے پر میں مزید کفرم ہوا ہوں۔“

”تم نے میرے اس سے پہلے والے آرٹیکلز بھی پڑھے ہیں لیکن وہ کسی خاص اخبار میں تو نہیں چھپے تھے۔“

وہ اس کی بات کا یہی مطلب سمجھی تھی کہ وہ اس کے پچھلے آرٹیکلز کا حوالہ دے رہا ہے۔ وہ اس کا سوال ہی نہ کر سکا لیکن جواب میں بولا کچھ نہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ وضاحت چاہنے کے لیے مزید سوال کرتی اور جلدی سے بولا۔

”بھوک لگ رہی ہے۔ چلو چل کر کچھ کھاتے ہیں۔“

وہ اس موضوع کو کسی اگلی نشست کے لیے اٹھا رکھنے کا سوچتے ہوئے اس کی کھانے والی بات کا جواب دینے لگی تھی۔ کچھ دیر بعد جب وہ دونوں ایک ریسٹورنٹ میں داخل ہو رہے تھے تو وہ بہت سنجیدگی اور بردباری سے حزرہ کو مخاطب کر کے بولی۔

”اگرچہ کہ یہاں میزبان اور مہمان تم ہو۔ لیکن چونکہ میرے بل پے کرنے سے تمہاری مردانہ انا کو سخت تکلیف پہنچنے کا شدید خطرہ ہے اس لیے میں از خود تمہیں یہ موقع دے رہی ہوں کہ بل تم پے کرو۔ ہر وہ جگہ

یہاں خرچہ کرنے کے لیے اس کا اسکان ہو میں سوچتے ہیں کہ حساب سے میزبان اور مہمان دونوں بن جاتی ہوں۔ اس معاملے میں میرے ساتھ انا وغیرہ کا کوئی مسئلہ نہیں۔“

وہ اس کی برجستگی کو اجوائے کرتا ہوا ہنسنے لگا۔ وہ واقعی اپنی کبھی بات کے عین مطابق بڑی شان بے یازاری سے ایک میز منتخب کرتی کمری پر بیٹھ گئی تھی۔ جبکہ حمزہ کاؤنٹر پر کھڑا ان دونوں کی ٹرے تیار کروا رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں وہ بھی تمام مطلوبہ اشیاء لے کر میز پر آ گیا۔

”ایک تو یہ برگر بھی میرا فیورٹ ہے۔ اس پر سے یہ کہ اس کا بل بھی میری جیب سے ادا نہیں ہوا اس لیے ہمیشہ سے بھی زیادہ مزے کا لگ رہا ہے۔“

وہ بڑے مزے سے کھاتے ہوئے بول۔ برگر کے لیے اس کی پسندیدگی کا سن کر حمزہ نے ایک اور برگر لانے کا پوچھا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”ایسی خوش خوراک بھی نہیں ہوں میں۔“

بہت خوشگوار ماحول میں کھانا کھا کر وہ دونوں گھر واپس آ گئے۔



”نیوز تو ٹائپ ہو گئی۔ اب کالم بنانے لے جائیں۔“ مانیٹر پر سے نظریں ہٹا کر وہ مناہل سے بولی۔

”ہاں کالم بنائیے۔ پھر نیوز Cut and Paste کیجیے۔ کیا بوریت ہے یار۔“ مناہل نے منہ باناتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا تھا کیپوٹر لیب میں اس وقت ان کی Subbing کی کلاس ہو رہی تھی۔ وہ اس کام کو جتنا انجوائے کرتی تھی۔ مناہل اتنا ہی اس سے چرتی تھی۔

”اگر یہی حال رہا تو تم بیچ میکانگ سیکھ چکیں۔“ دو بارہ مانیٹر کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اس نے اسے ڈانٹا تھا۔

”تم کافی ہونا یہ سب سیکھنے کے لیے۔ نیوز کہاں لگتی ہے؟ کتنے کالمز کی ہونی چاہیے؟ اشتہار کس جگہ ایڈجسٹ کرنا ہے؟ یہ کوئی لڑکیوں کے پڑھنے والا مضمون ہے۔ لڑکیاں تو بلکہ پھلکے مضامین پڑھتی ہوئی ابھی لگتی ہیں۔ چنانچہ کیا خناس سما یا تھا جو میں اتنی مشکل پڑھائی میں آ کر پھنسن گئی۔“

وہ دونوں ایک ہی ”پی سی“ استعمال کر رہی تھیں لیکن کام صرف فریا کر رہی تھی۔ مناہل سوائے بولنے کے کچھ نہیں کر رہی تھی۔ کلاس ختم ہونے پر سون کا سانس لیتی وہ یوں اٹھی جیسے اس سے پہلے کتنی محنت کر رہی تھی۔ وہ اسے گھورتی ہوئی لیب سے باہر نکل آئی لیکن پہلے ہی قدم پر اسے ٹھنک کر رک جانا

پڑا۔ گوریہ درمیں یہ کھینچنا وصلے پر سعد کھڑا ہوا تھا۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر بے خود
 حیران ہوتی تیزی سے اس کے پاس آئی۔ وہی کیا بات ہوئی جو سعد نے نیورٹل آبا۔ اس وقت تو اسے
 اپنے آنس میں ہوتا چاہیے تھا۔

”سب خیریت تو ہے سعد؟“

”آپ کی دعاؤں کی بدولت سب خیریت ہی خیریت ہے۔“ اس کے سیدھے سارے سوال کا بڑے
 تپے ہوئے انداز میں جواب دیا گیا تھا۔ وہ اس کے چہرے پر نظر آتی برہمنی اور ہارنسی کو تعجب سے دیکھ
 رہی تھی۔

”کیا بات ہو گئی ہے سعد! اتنے اکھڑے اکھڑے سے کیوں ہو رہے ہو۔“ وہ ہارنسی کی وجہ نہیں جانتی
 تھی لیکن یہ بات تو صاف پتا چل رہی تھی کہ وہ اس سے ناراض ہے۔

”کوئی بات نہیں ہوئی یونہی میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ وہ ان ہی لہجے میں سمیت بولا۔

”اس طرح سے کیوں بات کر رہے ہو تم۔ کیا کر دیا ایسا میں نے جس پر تم یوں ہنسا ہو رہے ہو۔“ وہ اار
 کے بلاوجہ اکرنے پر آخر کار چڑ گئی تھی۔

”تم کل اس ایڈیٹ کے ساتھ کہاں جا رہی تھیں۔ یونہی ذرا ڈٹنگ کا پروگرام ہے ہمارا۔“

اس نے حمزہ کے لہجے کی نقل اتاری۔ وہ حمزہ کے لیے اتنے برے الفاظ استعمال کرنے پر اسے غصے سے
 دیکھ رہی تھی لیکن وہ اس کے غصے کو نظر انداز کر کے اسی برہمن سے انداز میں بولا۔

”بڑی سیرس ہو رہی ہیں۔ میں پانچ دن سے تمہارا فون نہ آنے پر یہی سمجھتا رہا کہ پڑھائی میں بڑی
 ہو۔ خود بھی جان کر اسی لیے فون نہیں کیا کہ کہیں میری وجہ سے تمہاری پڑھائی اٹھ رہی نہ ہو جائے۔ یہ
 بات تو کل معلوم ہوئی کہ مصروفیت پڑھائی کی نہیں۔ حمزہ شجاع احمد کے ساتھ سیر و تفریح کرنے کی ہے۔“
 وہ اس کی اتنی فضول باتوں پر سخت غصے میں آ گئی۔

”تم ہوش میں تو ہو سعد! تم یہاں پر مجھ سے یہ اتنی گھٹیا باتیں کرنے آئے ہو۔ مجھے افسوس ہو رہا ہے
 تمہاری پست ذہنیت پر۔ وہ میرا کزن ہے۔ ہمارے گھر مہمان ہے۔ میرا فرض قہر ہے کہ میں اسے سب
 دوں اور اگر میں اس کے ساتھ کہیں گئی تھی تو اپنے گھر والوں کی اجازت سے گئی تھی۔ تمہارے بے شمار
 دوست ہیں میرے علاوہ۔ تم ان کے ساتھ جہاں مرضی جاتے ہو گھومتے پھرتے ہو۔ میں نے کبھی اس پر
 اعتراض نہیں کیا۔ پھر میرے بارے میں بھی کوئی اعتراض کرنے کا تمہیں قطعاً کوئی حق نہیں ہے۔“

اور بغیر کسی لحاظ کے بولتی چلی گئی تھی۔ سعد نے بڑی خاموشی اور سنجیدگی سے اس کی بات سنی۔ پھر وہ بغیر ہاتھ کے تیزی سے واپس مڑ گیا تھا۔ اسے تیز تیز قدم اٹھا کر جاتے دیکھ کر وہ یک دم ہی اپنا غصہ اور خفگی اٹھال گئی تھی۔ یوں خاموشی سے کسی جگہ سے چلے جانا سعد کا مزاج نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ سعد نے اس لہجے میں اس کے ساتھ کبھی بات نہیں کی تھی لیکن اس کی یہ خاموشی اور گہری سنجیدگی اسے بوکھلا گئی۔ اس نے بے اختیار اسے زور سے آواز دی۔ وہ اس کی آواز نظر انداز کر کے اسی رفتار سے چلتا کوریڈور کے آخری سرے پر پہنچ کر مڑ گیا تھا۔ وہ اس سے ناراض ہو کر جا رہا ہے۔ یہ سوچ دوسری ہر سوچ پر حاوی تھی۔ وہ بڑی سے چلتی اس کے پیچھے آئی تھی۔ چلتی بھی کیا تقریباً بھاگتی ہوئی۔

”میری بات سنو سعد۔“

اس نے اسے ہاتھ پکڑ کر روکا۔ کتنے لوگوں نے اس کی اس حرکت پر اسے تعجب سے دیکھا تھا۔ لوگوں کی نگاہوں اور اپنے یوں بھاگنے پر شرمندہ ہوتے ہوئے اس نے اس کے ہاتھ پر سے اپنا ہاتھ واپس لیا۔

”تم میرے ساتھ اس طرح سے بی بیو کیوں کر رہے ہو؟“ وہ اس کی آنکھوں سے جھانکتی خفگی دیکھ کر رو بانسی ہو گئی تھی۔

”پلیز اس طرح سے ناراض ہو کر مت جاؤ۔“

”میں تم سے ناراض نہیں ہوں فریاد۔“

وہ اس کی طرف دیکھے بغیر اسی سنجیدگی سے بولا۔ وہ اس کے اجنبیت بھرے انداز پر ساکت کھڑی رہ گئی تھی اور سب کے لیے وہ فریاد ہو سکتی تھی لیکن سعد تو اسے کبھی اس نام سے نہیں پکارتا تھا۔ کتنی غیریت اور دوری کا احساس اٹھ رہا تھا اس کے یوں نام لینے پر۔ وہ اس کے چہرے پر بکھرے ملال کو نظر انداز کر کے چلا گیا تھا جبکہ وہ ہنوز وہیں کھڑی ہوئی تھی۔

گھر واپس آ کر اس نے بے شمار مرتبہ سعد سے اس کے موبائل پر بات کرنی چاہی تھی۔ لیکن وہ فون اٹینڈ ہی نہیں کر رہا تھا۔ یہی تھا اس کا نمبر دیکھ کر ہی وہ کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ رات میں اس کے گھر فون کیا تو بھی فخر و غرور نے یہی جواب دیا تھا کہ سعد گھر پر نہیں ہے۔ پتا نہیں وہ سچ بول رہا تھا یا جھوٹ۔ لیکن اسے یہی لگا کہ اسے سعد نے یہی بات کرنے سے منع کیا ہوگا۔ چھوٹی موٹی ٹھکرار تو ان کے درمیان اکثر ہو جایا کرتی تھی۔ لیکن اس طرح سے ان دونوں میں سے کوئی بھی کبھی ایک دوسرے سے ناراض نہیں ہوا تھا۔

ان کی دوستی میں خاموش اور ناراضی کا کوئی گز نہیں تھا۔ کسی کو کسی کی کوئی بات بری لگتی تو منہ پر برا بھلا کر اسی وقت معاملہ ختم کر دیا جاتا تھا۔ پھر اب وہ اس طرح کیوں کر رہا تھا۔ اس روز نہ اسے اپنی فیور بریانی اچھی لگی نہ پڑھنے میں دل لگا اور نہ ہی پرسکون نیند آئی۔

صبح وہ یونیورسٹی جانے کے لیے معمول سے پہلے گھر سے نکل گئی تھی۔ اس نے گاڑی سعد کے گھر روکی۔ اسے یقین تھا کہ اس وقت وہ اسے گھر پر ضرور مل جائے گا۔ ابھی وہ آفس کے لیے نہیں نکلا اور گھر پر اس کے سامنے کھڑے ہو کر وہ یہ بھی نہیں کہہ سکے گا کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔ آنٹی انکل کے جانے کے بعد وہ سعد کے گھر بہت کم آتی تھی۔ ان کی دوستی میں ایسی کوئی بات موجود نہیں تھی لیکن لوگوں کی ذہنیت تو تبدیل نہیں کر سکتی تھی اس لیے خود ہی محتاط ہو گئی تھی۔ یہاں وہ کبھی مہمان نہیں آتی تھی۔ چونکہ کیدار نے فوراً ہی اس کے لیے گیٹ وا کر دیا۔ وہ پورے استحقاق سے اندر آ گئی۔ لاؤنج ہوتی وہ بچن کی طرف آئی تو فخر و جلدی جلدی انڈر فرائی کر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ کچھ گنگنایا بھی جا رہا تھا اسے دیکھتے ہی گنگناہٹ کو بریک لگ گئے تھے۔

”السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام۔ سعد گھر پر ہے یا ابھی بھی واپس نہیں آیا۔“ اس کا انداز سراسر طنزیہ تھا۔ وہ اس کے طنزیہ انداز پر بوکھلاتے ہوئے جلدی سے گردن ہلا گیا تھا۔

”وہ اپنے کمرے میں تیار ہو رہے ہیں لیکن۔“

لیکن آگے وہ ہچکچا کر چپ ہو گیا۔ اس سے منہ پر یہ بات کہہ نہیں پارہا تھا کہ کل شام سے وہ گھر سے کہیں نہیں گئے اور انہوں نے کسی سے بھی ملنے اور فون پر بات کرنے سے منع کر رکھا ہے اور ”کسی“ کی اس کیٹیگری میں آپ بھی شامل ہیں۔

وہ اس کا جواب سن کر سیدھی میزھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے کمرے کا دروازہ تھپتھپایا تو اندر سے فوراً اجازت مل گئی تھی۔ وہ آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ وہ گلے میں ثانی لٹکائے ڈریسنگ ٹیبل کے پاس کھڑا دراز میں سے کچھ نکال رہا تھا۔ اس کے حساب سے اندر آنے والی شخصیت فخر و کی ہوئی چاہیے تھی اس لیے کسی خاص توجہ سے سر اٹھا کر دیکھا بھی نہیں تھا۔

”آپ گھر میں موجود ہیں یا کہیں گئے ہوئے ہیں بہت ضروری کام سے۔ واپسی کا بھی کچھ کہہ نہیں سکتے۔ کب ہوگی۔“

وہ اس کے پاس آ کر رک گئی۔ سعد نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر کوئی جواب دیے بغیر اپنا رخ شیشے کی طرف کر لیا۔ گلے میں جھولتی ٹائی کو سیدھا کر کے وہ جلدی جلدی ٹائی باندھنے لگا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے برش اٹھالیا۔ وہ جیسے یہاں موجود ہی نہیں تھی۔ بالوں میں برش کرتا وہ اس وقت کمرے میں ٹوکوتا پوز کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کتنا بھی ناراض ہے لیکن اسے صبح اپنے گھر میں دیکھ کر فوراً کی ساری ناراضی بھول جائے گا۔ لیکن اس کا رویہ اس کے خیالات کی نفی کر رہا تھا۔ اسے رست و اوج پہننے کے بعد والٹ جیب میں ڈالتے دیکھ کر وہ بہت دکھی ہوئی تھی۔ اسے نظر انداز کر کے جانے کے لیے مکمل ہار تھا۔ اس کا دل ایک دم بھر آیا۔

”مجھ سے بات کرو سعد! لڑو جھگڑو برا بھلا کہو لیکن ایسا اجنبیت بھرا سلوک تو مت کرو۔“ وہ آنکھوں میں آنسو لیے اس کے پاس کھڑی تھی۔

”تم سے لڑنے کا مجھے کوئی حق نہیں ہے بلکہ میں تو تم پر سرے سے کوئی حق رکھتا ہی نہیں ہوں۔“ وہ اس کے پاس سے ہٹ کر بیٹنگر میں سے اپنا کوٹ نکالنے لگا۔

”تم مجھ پر ہر طرح کا حق رکھتے ہو۔ مجھ سے لڑنے کا جھگڑا کرنے کا باز پرس کرنے کا نانا ابا اور نانی امی کے بعد تم ہی وہ واحد شخص ہو جسے میں نے اپنے بارے میں ہر طرح کا حق دے رکھا ہے۔“ اس کی نگہانی پرفریا کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

”غصے میں انسان بہت سی باتیں بغیر سوچے سمجھے بول دیتا ہے اس کے الفاظ کا وہ مطلب نہیں ہوتا۔ میں نے غصے میں ایک بات یونہی بول دی اور تم نے اسے دل پر لے لیا۔ اسے سچ سمجھ لیا۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

اسے روتا دیکھ کر اس کے کوٹ پہننے ہاتھ بالکل ساکت ہو گئے تھے۔ کوٹ بیڈ پر اچھا لٹا وہ تیزی سے اس کے پاس آیا۔ وہ ایک طرف کھڑی سر جھکائے روئے چلی جا رہی تھی۔ ساری دنیا میں یہی وہ واحد شخص تھا جس سے اس نے اپنے آنسو کبھی نہیں چھپائے تھے۔ جب کبھی وہ دکھی ہوئی اس نے خود کو تہا مسوس کیا، آنسو بہانے کے لیے ایک کندھا تلاشا تو اپنے سب سے نزدیک اس شخص کو پایا تھا۔ نانا ابا اور نانی امی کے سامنے وہ کبھی نہیں روتی تھی۔ انہیں اپنے آنسوؤں سے دکھی کرنا اسے کبھی اچھا نہیں لگا تھا لیکن اس کے پاس بیٹھ کر وہ رو بھی سکتی تھی اپنے دل کی ہر بات کہہ بھی سکتی تھی۔ اسی لیے اس وقت جب وہ اس کے سامنے کھڑی رو رہی تھی تو نہ اپنے رو پڑنے پر شرمندہ تھی نہ اس سے اپنے آنسو چھپانے کی کوشش

کر رہی تھی۔ یہ آنسو ہمیشہ اس نے خشک کیے تھے تو پھر آج بھی اسے ہی کرنے تھے۔ سعد نے ہاتھ کی اسے بیڈ پر بٹھایا۔ پھر وہ پلٹ کر فریج میں سے پانی کی بوتل نکال کر اس کے لیے پانی نکالنے لگا تھا۔

”پانی پی لو فری۔“ وہ گلاس ہاتھ میں لیے اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔ اس نے اس کا ہاتھ پیچھے ہٹا دیا۔

”نہیں بیٹا مجھے کوئی پانی وانی۔ اور میں فری کب سے ہو گئی۔ میں تو فریا ہوں نا۔ اسی اجنبی انداز نام لو تم میرا۔“ وہ روتے ہوئے بلند آواز میں بولی تھی۔

”ابھی خود ہی کہہ رہی تھیں کہ غصے میں انسان بہت سی باتیں سوچے سمجھے بغیر کہہ دیتا ہے۔ مجھے بھی آ گیا تھا تم پر۔“ وہ اس کے آنسو صاف کرتا ہوا بولا۔ اس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

”اب کبھی مجھ سے اس طرح ناراض مت ہونا سعد۔“ اس کے چہرے سے ناراضی کی دھند چھٹی دیکھ کر وہ بے اختیار بولی تھی۔ وہ بہت گہری نگاہوں سے اس کی روئی ہوئی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

جواب میں خاموش دیکھ کر وہ ایک مرتبہ پھر مضطرب ہوئی تھی۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ تمہیں میرا حمزہ کے ساتھ جانا برا کیوں لگا۔ وہ بہت اچھا لڑکا ہے سعد! ہر ڈینٹ، کلچر ڈاؤر مہذب حالانکہ وہ مجھ سے صرف ڈیڑھ سال بڑا ہے لیکن اپنی اتج سے بڑھ کر سچو اور ذمہ دار ہے۔ وہ ایسے تم نے مجھے کسی اور کے ساتھ کبھی آتے جاتے دیکھا ہے۔ کزنز میں بھی جن لڑکوں میں اچھا نہیں سمجھتی ان کے ساتھ بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی۔ اور تم بھی اس بات کو اچھی طرح جانتے ہو۔ تم پتا نہیں کیوں آسے غلط سمجھ رہے ہو۔ نانا ابا کا تمہیں پتا ہے نا وہ بہت کم لوگوں سے متاثر ہو رہے ہیں اور حمزہ ان ہی کم لوگوں میں شامل ہے۔ تم ایک بار اس کے ساتھ تفصیل سے بیٹھ کر بات کر کے دیکھو تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ میں اس کے بارے میں جو کچھ کہہ رہی ہوں وہ بالکل سچ ہے۔ اس نے میرے ساتھ بلا وجہ بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کی۔ وہ مذاق بھی کرتا ہے میرے ساتھ باتیں بھی کرتا ہے، لیکن ایک مخصوص فاصلہ رکھ کر۔“

وہ حمزہ کی طرف سے اس کا دل صاف کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سعد خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا ضرور ہاتھا لیکن حمزہ کا نام سنتے ہی اس کے چہرے پر ناگواری سے بھر پور تاثر پھیل گیا تھا۔

”تم ناشتہ کر کے آئی ہو فری؟“ اس کے خاموش ہوتے ہی اس نے پوچھا۔ وہ اپنی اتنی طویل تقریر پر جواب میں اتنی غیر متعلقہ بات کی اس سے توقع نہیں کر رہی تھی۔

”پہلے تم میری بات کا جواب دو۔ بلا وجہ بات مت بدلو۔“ وہ خفگی سے اس کی سمت دیکھ رہی تھی۔

”کیا جواب دوں میں تمہاری بات کا فری! یہ کہ تمہارا ذہن فطین، کلچر ڈاؤر ہینڈسم کزن جو تمہیں بہت اچھا لگتا ہے مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ اب تم اس ناپسندیدگی کی وجہ پوچھو گی تو وجہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اس بے چارے نے میرا کچھ نہیں بگاڑا۔ یوں سمجھ لو میں بلا وجہ اس سے چڑتا ہوں۔ شاید اس کے بارے میں.... ہوتا ہے ناں کسی کسی سے ہم خواستخواہ چڑتے ہیں۔ تمہارے اٹلکچوئل کزن صاحب بھی بس بلا وجہ ہی مجھے برے لگتے ہیں یا پھر شاید میں اس کی ذہانت سے جلیس ہوتا ہوں۔ یہ سوچ کر نا امانی کبھی میری ذہانت کی تو یوں تعریف نہیں کی۔ بلکہ ہمیشہ وقت کی قدر کرو۔ دوستیوں میں وقت برباد نہ کرو وغیرہ پر طویل لیکچر ہی دیے ہیں۔“

عجیب سا انداز تھا سعد کا۔ طنزیہ سے لہجے میں وہ جیسے خود اپنا مذاق اڑا رہا تھا۔ فریا کی اپنے چہرے پر مرکوز گہری نگاہوں سے بچنے کی خاطر وہ فوراً ہی اس کے پاس سے اٹھ گیا۔

”چلو چل کر ناشتہ کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے تم نے بھی ناشتہ نہیں کیا ہوگا۔“ اس نے اسے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ وہ اس کے ساتھ چلتی ہوئی کچن میں آگئی۔ فخر و کچن ٹیبل پر ناشتہ لگائے اس کی آمد کا منتظر کھڑا تھا۔

”ٹھیک ہے تم جاؤ۔“ سعد نے اسے کچن سے فارغ کیا۔

”کیا کھاؤ گی؟“ اسے معلوم تھا وہ آملٹ نہیں کھاتی۔ اسی لیے اپنے لیے موجود ناشتہ اسے پیش نہیں کیا تھا۔

”یوٹوسٹ رکھے ہیں ناں۔ بس یہی ٹھیک ہے۔ تم فرنیچ سے چیز نکال لو۔“ وہ کرسی گھسیٹ کر آرام سے بیٹھ گئی تھی۔

”اتنا عام سا ناشتہ۔ یار! اب تم اتنا روٹی ہو۔ وہ بھی میری وجہ سے تو میرا فرض بنتا ہے تمہیں کچھ یونیک سا ناشتہ کراؤں۔ رونے میں تمہاری جو اجر جی برباد ہوئی ہے اور کئی لیٹر آنسو ضائع ہوئے ہیں ان کا ازالہ تو کرنے دو۔“

وہ اپنی ازلی و فطری شوخی کی طرف پلٹتا ہوا شرارتی انداز میں بولا۔ کچھ دیر پہلے کی سنجیدگی اب ڈھونڈنے سے بھی نظر نہیں آرہی تھی۔

”ایسی میری فکر ہو تو رلواؤ ہی کیوں۔“ وہ منہ پھلا کر بولی۔ وہ اس کے منہ پھلانے پر مسکراتا ہوا فرنیچ سے اسٹرابریز اور دودھ کا ڈبائکا لئے لگا۔

”تمہارا ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے سعد۔“ اس نے سعد کو ٹوکا۔

”میں یہی کھالوں گی ناں۔ خواجواہ تمہاری اتنی اچھی اور محنت سے کی گئی تیاری کا بھی ستیا ناں ہو جائے گا۔“

وہ اس کی بات سنی ان سنی کرتا آستینیں فولڈ کیے اپنے کام میں مصروف تھا۔
 ”اور یہ تیاریوں کے پیچھے کیا راز ہے۔ لگتا ہے کسی خوبصورت سی کو لیگ کو متاثر کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔“ وہ اسے چھیڑنے سے خود کو باز نہیں رکھ پائی تھی۔
 ”اتنے درست اندازے کیسے لگانے لگی ہو تم۔“ وہ پلینڈر میں دودھ ڈالتا ہوا بولا۔
 ”گھاس تھوڑی کھاتی ہوں میں سعد منیر صاحب۔“

وہ شیک تیار کر چکا تھا۔ جگ میں اسٹراپیری شیک نکال کر اس نے ایک گلاس اٹھایا اور پھر دونوں چیزیں لاکر میز پر اس کے سامنے رکھ دیں۔ خود بھی اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔
 ”شروع ہو جاؤ اور یہ پورا جگ تمہیں خالی کرنا ہے۔“ ناشتہ شروع کرتے ہوئے اس نے اس سے کہا تھا۔ وہ پورے جگ والی بات پر بے ہوش ہوتے ہوتے پئی۔
 ”کیا اس کے بعد میں کسی محاذ جنگ پر بھیجی جانے والی ہوں۔“ وہ اس کے ڈرنے پر ہنس پڑا۔ پھر اس کے بعد وہ دونوں خاموشی سے ناشتہ کرنے لگے تھے۔

”حمزہ کتنے دنوں کے لیے آیا ہے؟“ ناشتہ کرتے کرتے وہ اچانک پوچھ بیٹھا۔ اسے دوبارہ اسی موضوع پر آتا دیکھ کر وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔
 ”وہ اپنے کسی اسائنمنٹ کے سلسلے میں آیا ہے۔ جیسے ہی اس کا کام ختم ہوا وہ چلا جائے گا اور یہ کام کتنے دنوں میں ختم ہوگا اس بارے میں مجھے کچھ آئیڈیا نہیں ہے۔“

وہ گلاس خالی کر چکی تھی۔ سعد اس کے خالی گلاس میں جگ میں سے اور شیک ڈالنے لگا تو اس نے منع کر دیا۔

”میں گھر سے بھی چائے پی کر آئی تھی۔ بس اب اور نہیں لوں گی۔“ وہ بہت الجھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔
 ”مائی سویٹ باربی! اسے پی کر آپ بالکل بھی موٹی نہیں ہوں گی۔ سوکھی سڑی باربی ہی رہیں گی۔“ وہ شگفتگی سے بولا۔ وہ اس کی بات پر سنجیدہ ہی رہی تھی۔

”وائٹ کلر تم نے خوب موقع پر پہنا ہے۔ اب یہ پتا نہیں کہ خاص طور پر دوستی اور صلح کے لیے پہنا گیا ہے یا یہ محض اتفاق ہے۔ ویسے یہ کلر تم پر بہت سوٹ کر رہا ہے۔“ وہ اس کی تعریف پر بھی نہیں مسکرائی تھی۔

”کیا سوچنے لگیں؟“ سعد نے اس کے سامنے ہاتھ لہرایا تھا۔
 ”کچھ خاص نہیں۔“ وہ سنجیدگی سے جواب دیتی کرسی پر سے اٹھ گئی۔

”تم ہی کہا کرتے ہو ناں سعد کہ ایک بہت قریبی دوست کو گھڑی گھڑی اپنے خلوص کا یقین دلانا بڑا اسٹینڈنگ لگتا ہے اور تم میری اس عادت سے چڑتے بھی ہو۔ پھر اب تم خود بھی اسی چیز کا مظاہرہ میرے ساتھ کر رہے ہو۔ میرے لیے کیونکہ یہ پہلا موقع ہے اس لیے مجھے بہت عجیب سا لگ رہا ہے۔ تمہیں مطمئن کرنا صفائی دینا۔ یہ کہنا کہ سعد تم آج بھی میرے لیے وہی سعد ہو۔ وہی سعد جو میرا بہترین دوست ہے۔ جس سے میں اپنے دل کی کوئی بھی بات کبھی بھی نہیں چھپاتی۔ تمہاری طرح میرے بے شمار دوست نہیں مگر جو چند دوست ہیں ان میں سعد منیر کا مقام اور اس کی جگہ باقی سب سے جدا ہے۔“
 سعد خاموش بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی بات مکمل کرتے ہی بغیر اس کا جواب سننے کچن سے نکل گئی۔ وہ کافی دیر تک چپ چاپ وہیں بیٹھا رہا تھا۔



فجر کی نماز پڑھ کر وہ باہر لان میں آ گئی۔ ننگے پاؤں گھاس پر چلتے وہ صبح کے اس منظر کی دلکشی میں کھوئی ہوئی تھی۔ ابھی ٹریفک کا شور اور دھواں فضا میں نہیں بکھرا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی خوشگوار سی ہوا ہر قسم کی آلودگی اور کثافت سے پاک تھی۔ ہر چیز خاموشی کی دبیز چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ اجالا ابھی پوری طرح نہیں پھیلا تھا۔ یونہی چہل قدمی کرتے ہوئے وہ آج دن بھر میں کون کون سے ضروری کام نمانے ہیں کی فہرست مرتب کر رہی تھی۔ لان کی طرف آتے حزرہ کو اس نے بہت تعجب سے دیکھا۔

کل رات وہ کتنے بچے گھر واپس آیا یہ تو اسے معلوم نہیں تھا۔ اپنے کمرے میں پڑھتے پڑھتے روزانہ سے کچھ جلدی ہی وہ سو گئی تھی۔ ڈھائی تین بجے کے قریب اس کی آنکھ کھلی تو کتاب رائٹنگ ٹیبل پر رکھنے اور لائٹ آف کرنے وہ بستر سے اٹھی۔ تب اپنے کمرے کی کھڑکی سے اس نے حزرہ کے کمرے کی لائٹ آن دیکھی۔ لائٹ آن دیکھ کر ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ جاگا ہوا ہے۔ وہ چہرے پر خوشگوار سی مسکراہٹ لیے اس کے پاس آ گیا تھا۔

”تم اتنی صبح کیسے اٹھ گئے؟“ سلام دعا کے فوراً بعد اس نے پوچھا۔
 ”کیا میں تمہیں شکل سے مسلمان نظر نہیں آتا۔“ حزرہ نے اس کے سوال پر برامتنے والے انداز میں

کہا۔

”نہیں۔ میرا کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے۔“ وہ وضاحتی انداز میں بولی لیکن حمزہ نے اسے بات پوری نہیں کرنے دی۔

”ہاں۔ مجھے پتا ہے تمہارا یہ مطلب نہیں ہے۔ اصل میں یہاں جلدی جلدی کام ختم کرنے کی دھن میں میں نے اپنا سارا روٹین ہی بگاڑ لیا ہے۔ رات رات بھر جاگنے کی وجہ سے فجر کی نماز اکثر قضا ہونے لگی ہے۔ کل خود ہی شاید تھوڑی سی شرم آگئی تھی۔ اس لیے آج جاگ گیا۔ تب بھی شیطان نے ورغلا یا کہ نماز گھر پر ہی پڑھ لو۔ میں نے سوچا جلدی سے پڑھ کر دوبارہ سو جاؤں گا لیکن جیسے ہی دوبارہ سونے کے ارادے سے بیڈ پر آنے لگا تو تم لان میں واک کرتی نظر آ گئیں۔“

وہ اس کے ساتھ واک کرنے لگا۔

”آج انشاء اللہ میرا کام ختم ہو جائے گا۔ آج شام میں یا پھر کل صبح واپس چلا جاؤں گا۔ بس اسی لیے میں نے سوچا کہ بجائے سونے کی تھوڑی سی تمہارے ساتھ باتیں کر لی جائیں۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

”رات میں‘ میں نے دیکھا تھا۔ تمہارے کمرے کی لائٹ آن تھی۔ میرا خیال ہے تم کافی دیر تک جاگتے رہے ہو۔“ وہ جواباً گویا ہوئی۔

”بس وہ کمپیوٹر پر کچھ کام تھا۔ کرتے کرتے وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ چارج گئے تھے کام کرتے۔“

”تمہارا یہ لیپ ٹاپ ہر جگہ تمہارے ساتھ جاتا ہے۔“ کمپیوٹر کے ذکر پر وہ اس کے ہمراہ لائے ہوئے لیپ ٹاپ کے بارے میں پوچھنے لگی تھی۔

”محترمہ! میں اکیسویں صدی کا صحافی ہوں۔ اگر کوئی صحافی اپنے کسی پروفیشنل کام سے کسی دوسرے شہر یا ملک جا رہا ہے اور وہ بھی بغیر لیپ ٹاپ اور ڈیجیٹل کیمرے کے تو اس کا مطلب ہے وہ اب تک اکیسویں بیسویں صدی میں جی رہا ہے۔“ اس کے استفسار کا اس نے منفصل جواب دیا تھا۔

”کل میں اپنے لیے کچھ کتابیں خریدنے گیا تھا۔ وہاں سے میں نے تمہارے لیے بھی ایک کتاب خریدی ہے“ گلوبلائزیشن“ پر کافی جامع اور مدلل کتاب ہے۔“

”میرے لیے۔“ اس نے متعجب سے انداز میں اپنی طرف اشارہ کیا۔ حمزہ نے جواباً سر اثبات میں بلایا۔ پھر خود ہی اپنی بات کی وضاحت کرنے لگا۔

”بس میرا دل چاہ رہا تھا کہ جانے سے پہلے تمہیں کوئی گفٹ دوں۔ بہت فور و فکر کے بعد تمہیں دینے

کے لیے کتاب کا تختہ سب سے بہترین لگا۔ "Capitalist Globalization" پر مصنف نے کافی تفصیل سے لکھا ہے۔ ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی مجھے اندازہ ہوا کہ کتاب اچھی ہے اور یقیناً تمہارے لیے ایک اچھی ریفرنس بک ثابت ہوگی اور جب بھی تم اسے پڑھو گی تو چلو اسی بہانے میں بھی تمہیں یاد آ جایا کروں گا۔"

اس کا وہی پر خلوص اور دوستانہ سا انداز تھا جو ہمیشہ ہوا کرتا تھا لیکن پھر بھی وہ چونک سی گئی۔ اس نے بغور حمزہ کی طرف دیکھا۔ وہ بھی گہری نگاہوں سے اس کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا لہجہ جتنا سادہ تھا آنکھیں اتنی سادہ ہرگز نہیں تھیں۔ وہ بے اختیار نظریں اس کے چہرے پر سے ہٹا کر گھاس پر مرکوز کر گئی تھی۔ فوری طور پر اس کا یہی دل چاہا کہ جلدی سے اندر چلی جائے لیکن ایسا کرتے تہذیب آڑے آ گئی تھی۔ اس نے ایسی کوئی بھی بات نہیں کی جو اس کی ناراضی کا سبب بنے پھر وہ کس طرح اس کے ساتھ بد اخلاقی اور بد تمیزی کا مظاہرہ کر سکتی تھی۔

حمزہ نے جیسے اس کے چونکنے اور بوکھلانے کا کوئی نوٹس لیا ہی نہیں وہ اب بھی بڑے مطمئن انداز میں اپنی خریدی باقی کتابوں کی تفصیلات سن رہا تھا۔ نانا بابا نماز پڑھ کر جلدی واپس آ گئے تھے۔ گیٹ سے گھستے ہی انہوں نے ان دونوں کو لان میں ایک ساتھ واک کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور خود بھی لان کی طرف ہی آ گئے تھے۔ ان دونوں کے سلام کا جواب دے کر وہ بھی واک میں شریک ہو گئے۔ کچھ دیر نانا بابا کی مرودت میں وہاں ٹھہر کر وہ ان دونوں کو واک کرتا چھوڑ کر معذرت کرتی اندر آ گئی۔

رات میں حمزہ اس کے کمرے میں آیا۔ وہ یہ جاننے کے باوجود کہ کل صبح وہ واپس چلا جائے گا اسے کمپنی دینے کے بجائے کمرے میں پڑھنے بیٹھی ہوئی تھی۔ نانی امی ملازمین کو ساتھ لگائے حمزہ کے لیے ڈنر پر خاص اہتمام کر رہی تھیں۔ حالانکہ اسے کچھ خاص پڑھنا بھی نہیں تھا پھر بھی وہ کچن میں ان کی مدد کرانے کے بجائے اپنے کمرے میں رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھی لیکچرزد دیکھ رہی تھی۔

دستک پر اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ وہ اس کے رسی سے اندر بلانے پر فوراً اندر آ گیا اور آرام سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں وہی کتاب تھی جس کا وہ صبح اس سے تذکرہ کر رہا تھا۔

"کوئی موقعہ ہو تو تختہ لینا اچھا لگتا ہے۔ تم بے شک یہ مجھے میری برتھ ڈے پر گفٹ کر دینا۔"

وہ واضح طور پر انکار نہیں کر پائی۔

"دوستوں کو تختہ دینے کے لیے کسی خاص موقع کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جب آپ کا دل چاہے تختہ دے

سکتے ہیں اور بدلے میں تم بھی اگر مجھے کوئی تحفہ دو گی تو میں لینے سے ہرگز انکار نہیں کروں گا۔“

وہ اس کے گریز پر سنجیدگی سے دو ٹوک انداز میں بولا۔ جو کتاب وہ اسے تحفہ میں دے رہا تھا وہ بہت مہنگی تھی۔ ایک غیر ملکی مصنف کی لندن میں پرنٹ ہوئی کتاب کا نیا ایڈیشن کتنا مہنگا ہو سکتا تھا۔ اس کا اسے اچھی طرح اندازہ تھا۔ لیکن یہاں مسئلہ تحفہ کی قیمت کا نہیں تھا۔ وہ حمزہ سے کوئی سستا اور بالکل معمولی سا تحفہ بھی نہیں لینا چاہ رہی تھی۔ لیکن اب اس کے پاس انکار کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اس کے مسلسل انکار پر وہ یقیناً برامان سکتا تھا اور اس بدتمیزی پر نانی امی اور نانا ابا بھی یقیناً ناخوش ہی ہوتے۔

اس کے ”تھینک یو“ کہہ کر کتاب ہاتھ میں لے لینے پر وہ ایک دم مسکرا دیا۔ وہ اس کے تحفہ قبول کر لینے پر خوش تھا اور اپنی خوشی چھپانے کی اس نے کوئی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ اس کی گہری نگاہیں اپنے چہرے پر محسوس کرتے ہوئے وہ خواہ مخواہ کتاب کے صفحے پلٹنے لگی۔ حمزہ اس کے اس انداز پر بے اختیار مسکرا دیا۔

”تم پڑھ رہی تھیں۔ میں نے آ کر تمہیں ڈسٹرب کر دیا۔“ وہ اسے خود ہی اس الجھن سے نکال کر اٹھ گیا تھا۔

وہ اسے صرف اور صرف ایک کزن اور مہمان سمجھ رہی تھی لیکن حمزہ اسے کیا سمجھ رہا تھا۔ کزن؟ دوست؟ یا اس سے بڑھ کر کچھ اور۔ اور کیا جو کچھ وہ سمجھ رہا تھا اسے سعد منیر نے فریاسے پہلے ہی سمجھ لیا تھا۔ ساری رات بہت بے چین اور مضطرب رہی تھی۔ پھر حمزہ کے جانے پر ہی اسے اس اضطراب سے نجات ملی تھی۔ اپنی تمام تر سوچوں کو وہ ہم قرار دیتے ہوئے اس نے خود کو اس بے چینی سے نکالا تھا۔



”چلے گئے مسٹر جینٹلس۔“ سعد کے پوچھنے پر اس نے بڑے عام سے انداز میں سر ہلا دیا تھا۔ بغیر اس کے طنزیہ انداز کا نوٹس لے۔

”پرسوں صبح چلا گیا تھا وہ۔“ وہ اس طرح بولی جیسے مسٹر جینٹلس میں چھپے طنز کا اسے پتا ہی نہیں چلا تھا۔ سعد اس کی لاپرواہی کے اس مظاہرے پر کسی قدر چڑسا گیا۔ نانا ابا اور نانی امی کی ویڈنگ اینورسری آنے والی تھی اور پچھلے سال کی طرح وہ اس سال بھی ان دونوں کو اچھا سا تحفہ دے کر اس دن کو خاص طریقے سے منانا چاہتی تھی۔ اکیلے بازار جانے کی ہمت نہیں تھی اس لیے سعد سے کہا تھا اور وہ کمال مہربانی سے فوراً مان بھی گیا تھا۔ اس وقت وہ مختلف دکانوں کا سروے کرتی کوئی خاص سی چیز ڈھونڈ رہی تھی جو ہمیشہ یاد رہنے والا ایک معمولی تحفہ بن سکے۔

”اتنا جینس اور اسمارٹ بندہ پتا نہیں پاکستان میں کیا کر رہا ہے۔ اسے کم از کم ٹائمنر جتنے اسٹینڈرڈ کے کسی ادارے کے ساتھ منسلک ہو جانا چاہیے تھا۔“ وہ بلاوجہ حمزہ کا ذکر لے کر بیٹھ گیا تھا۔

”آفرز تو آئی ہوئی ہیں اسے ٹائمنر واشنگٹن پوسٹ، گارجین اور نیوز ویک وغیرہ کی طرف سے۔ دیکھو شاید وہ کسی آفر پر غور کر ہی لے۔“

اسے معلوم تھا کہ اس روز جو اس نے حمزہ کی تعریفیں کی تھیں ان کے جواب میں وہ یہ طنزیہ باتیں کر رہا تھا۔ وہ چڑنے کے بجائے الٹا سے چڑانے لگی تھی اسی وجہ سے اس کا خود بخود ہی اس ٹاپک میں انٹرسٹ ختم ہو گیا تھا۔

”مئی پاکستان آرہی ہیں۔“ اس کے موضوع تبدیل کرنے پر خوش ہوتے ہوئے وہ ایک دکان میں گھسی۔ ”اس مہینے کے پانچ دن تو گزر چکے ہیں۔ بس یوں سمجھو کہ پچیس دن بعد مئی کراچی میں ہوں گی۔“

وہ مختلف ڈیکوریشن پیسز پر نگاہیں دوڑاتے ہوئے خوشگوار انداز میں بولا۔

”لیکن تم تو کہہ رہے تھے کہ آئی عید پر آئیں گی۔ پھر اب یہ اچانک آنے کا پروگرام کیسے بن گیا۔“

اس نے اپنی حیرت کا برملا اظہار کیا۔

”کچھ ضروری کام ہے انہیں کراچی میں۔ اس کے لیے وہ عید تک انتظار نہیں کر سکتی تھیں۔“ وہ روایتی جاپانی اسٹائل کے گلڈان اٹھا کر دیکھتا ہوا بولا۔

”یہ گلڈان اتنے لگ رہے ہیں فری۔“ وہ اس کی توجہ اس جانب مبذول کراتے ہوئے بولا تو وہ بھی پوری توجہ کے ساتھ گلڈانوں کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ خریداری سے فارغ ہو کر سعد کے ساتھ گھر واپس جا رہی تھی۔

”سعد! گاڑی روکو۔“ اس کا کہنے کا انداز ایسا تھا کہ بری طرح بوکھلاتے ہوئے اس نے بریک پر پاؤں رکھ دیا۔

”وہ دیکھو سامنے ٹھیلے پر گول گپے بک رہے ہیں اور میرا اتنے دنوں سے دل چاہ رہا ہے گول گپے کھانے کو۔“ اس بے نیاز سی معصومیت پر سعد کا دل چاہا کہ اس کا سر پھاڑ دے۔

”کیا ہوا تم مجھے اس طرح گھور کیوں رہے ہو۔“ وہ چہرے پر آتی مسکراہٹ اس سے چھپاتی معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔

”شکر تھا کہ گاڑی اس وقت سروس روڈ پر تھی اور ٹریفک بھی قدرے کم ہے ورنہ آپ نے ایکسپڈنٹ کروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔“ وہ برہمی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”نہیں کھلانا چاہ رہے تو صاف صاف منع کر دو بلا وجہ اکڑاؤں خوشی میں رہے ہو۔“ وہ اس کی برہمی پر ناراضی سے منہ پھلا کر لگایا ہوئی۔

”یہ اتنے گندے ٹھیلے پر سے تم الا بلا کھاؤ گی تمہیں گھن نہیں آئے گی۔“

”کوئی گندا دندا نہیں ہے۔“ انہیں کے گول گپے اتنے مزے کے ہوتے ہیں۔ میں دو تین بار کھا چکی ہوں اور جو برابر میں گولا گنڈے والا ہے نا۔ اس کا گولا گنڈا بھی بہت مزے کا ہوتا ہے۔ لوگ دور دور سے یہاں گول گپے اور گولا گنڈا کھانے آتے ہیں۔ تم اس کی ظاہری حالت پر نہ جاؤ۔ اصل چیز ذائقہ ہے۔ جس کی شہرت دور دراز تک پھیلی ہوئی ہے۔“ وہ چنچارے لیتے ہوئے جیسے ابھی سے ہی ان دونوں چیزوں کا مزہ لے رہی تھی۔

”وہ دور دراز سے آنے والے تمہارا ہی ہی طرح کے فضول لوگ ہوتے ہوں گے۔ جو اتنی غیر صحت مند چیزیں اپنے پلے سے پیسے خرچ کر کے کھاتے ہیں۔ مجھے تو کوئی مفت بھی کھلائے تو میں کبھی نہ کھاؤں۔“ وہ اسے گول گپوں کے لیے اتنا بے تاب دیکھ کر گاڑی سے اتر تو گیا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرنا ہرگز نہیں بھولا تھا۔ وہ اس کی بات پر لا پرواہی سے سر جھٹک کر اسے اپنے لیے گول گپے لاتا دیکھنے لگی۔ کچھ ہی دیر میں وہ واپس آ گیا۔

”بندہ اپنی اوقات کے حساب سے ہی بات کرتا ہے۔ حالانکہ میں تمہیں تمہارا فیوریٹ برگر اور چٹ پٹا رول کھلانے اور کپوچینو پلانے کا پورا پورا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن اب اگر ایک شخص کی اوقات ہی ٹھیلوں پر سے گول گپے کھانے کی ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔“

پلیٹ اس کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے وہ متاسفانہ انداز میں بولا۔ وہ ان کمٹنس پر کوئی دھیان دینے بغیر گول گپے کھانے میں مشغول ہو گئی۔

”ذرا ٹھیلے والے کو ہارن تو دو۔“ املی کا پانی اور منگیاؤں گی۔“ وہ دوپٹے سے آنکھیں اور ناک رگڑتے ہوئے اس سے مخاطب ہوئی تھی۔

”بعد میں اگر تمہارا گلا خراب ہونا تو میں نانی امی کو بتا دوں گا کہ یہ بازار کی اٹنی سیدھی چیزیں بڑے ذوق و شوق سے کھاتی ہے۔“

اس کی سوں سوں اور سرخ ہوتی آنکھوں کو دیکھتا وارنگ دے رہا تھا۔ اپنی بات کا اس پر کوئی اثر نہ آیا۔ کچھ کر اس نے ہارن بجا دیا تھا۔ اس نے ایک پلیٹ پر اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ گول گپے اور بھی منگوائے۔ سعد خاموشی سے اسے کھاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

”جب اپنی یورپین لکس کے ساتھ حرکتیں تم خالصتاً پاکستانی لڑکیوں والی کرتی ہو تو خاصی دلچسپ لگتی ہے۔“ گاڑی اشارت کرتے ہوئے سعد نے تبصرہ کیا تھا۔



وہ بے پاؤں گھر میں داخل ہوئی تھی۔ نانا ابا اور نانی امی سے ظاہر ہے ابھی گفٹ چھپانا تھا اور اگر وہ اسے دیکھ لیتے تو لازمی شاپنگ کی تفصیلات پوچھی جاتیں اور نانی امی تو شاید اس کے ہاتھ سے لے کر دیکھ لیتی۔ یہی سوچ کر وہ چپکے سے اندر آئی تھی۔ نانا ابا فون پر کسی سے بات کر رہے تھے۔

”مارے گئے۔“ وہ انہیں دیکھ کر منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ ایک تو وہ آئی ہی بہت خاموشی سے تھی۔ اسے وہ بھی گفتگو میں بہت زیادہ مگن تھے اس لیے انہیں اس کی آمد کی بالکل بھی خبر نہ ہوئی تھی۔

”یہ بات نہیں ہے قیصر۔ تم میری بات کو غلط طریقے سے سمجھ رہے ہو۔ فریا کے لیے حمزہ سے زیادہ مجھے کوئی بھی پیارا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے نہیں کہ وہ شجاع کا بیٹا ہے اور شجاع کو میں نے ہمیشہ بھتیجے سے بڑھ کر پایا ہی سمجھا ہے بلکہ اس کی ذاتی خوبیوں کی بنیاد پر۔ وہ بہت پیارا بچہ ہے۔ اس میں ہر وہ خوبی ہے جو میں فریا کے ہونے والے شوہر میں چاہ سکتا ہوں۔“ وہ چھوٹے نانا سے کیا بات کر رہے ہیں اور کس کے متعلق کر رہے ہیں سن لینے کے باوجود بھی وہ بے یقینی کے عالم میں گم صم سی کھڑی رہ گئی۔

”حمزہ اور فریا۔ فریا اور حمزہ۔“ اس کی سماعتوں میں یہ دو نام ایک ساتھ گونج رہے تھے۔

”یہ تم نے کیا کیا حمزہ۔“ اس کا دل اندر ہی اندر ڈوب رہا تھا۔ جو کچھ وہ سمجھ رہی ہے وہ غلط ہو۔ بات وہ تو جو اس کی سمجھ میں آ رہی ہے۔ لیکن بات کچھ اور کیسے ہو سکتی تھی۔ وہ تو وہی تھی جو اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ نانا اب شجاع انکل سے بات کر رہے تھے۔

”تمہارا خلوص اور تمہاری محبت سر آنکھوں پر بیٹا! مجھے پتا ہے فریا کو جتنی محبت اور اپنائیت تمہارے گھر میں ملے گی اور کہیں نہیں مل سکتی۔ لیکن پھر بھی فریا کی مرضی کے بغیر میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اس پر اپنا اہلہ مسلط کرنا میں کبھی پسند نہیں کروں گا۔ اگر وہ اس رشتے کے لیے راضی ہوئی تو ٹھیک ہے ورنہ دوسری

دورت میں تم اور نازیہ اس بات پر مجھ سے ناراض مت ہونا۔“

وہ بجائے سیڑھیوں کی طرف جانے کے خاموشی سے کچن میں چلی گئی۔ کافی دیر تک نانا ابائی چھوٹا نانا شجاع انکل اور نازیہ آنٹی سے بات ہوتی رہی تھی۔ اس کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ کچھ پہلے کی شاپنگ 'سعد کو زچ کر کے گول گپے کھانا اور تیز آواز میں گانے سننا سب اس کے ذہن سے گئے تھے۔ بس چند جملے تھے جن کی مسلسل اس کی ارد گرد دنگرار ہو رہی تھی۔

”جو فریا کی مرضی وہی میری مرضی۔ میں اس پر اپنا فیصلہ مسلط کرنا کبھی پسند نہیں کروں گا۔“

”شجاع کو میں نے بیحد بھتے سے بڑھ کر اپنا بیٹا ہی سمجھا ہے۔“

وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ذہن جیسے کچھ بھی سوچنے کے قابل ہی نہیں تھا۔ کافی دیر بعد اس نے خود کو بمشکل وہاں سے اٹھنے پر آمادہ کیا۔ آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتی وہ اوپر آئی۔

”مجھے تو حمزہ بہت! ندم ہے۔ اور پھر شجاع کے گھر سے بہتر اور کون سا گھر نہ ہو سکتا ہے ہماری فری لیے۔“

نانی امی کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرانی تھی۔ وہ اور نانا ابائی اپنے کمرے میں بیٹھے یقیناً کچھ دیر پہلے آنے والی شجاع انکل کی فون کال کو ہی ڈسکس کر رہے تھے۔

”پسند مجھے بھی وہ بہت ہے۔ بہت سلجھا ہوا مہذب اور ذہین لڑکا ہے۔ اپنے پروفیشن میں خوب کرے گا۔ اس کا کیریئر بہت شاندار ہوگا۔ لیکن اس سب کے باوجود اگر وہ فری کو پسند نہیں تو ہمارے پسند کرنے کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ زندگی تو اس نے گزارنی ہے۔ پسند کا حق بھی اسے ہی ملنا چاہیے۔ اگر وہ اس رشتے کو دل سے قبول کرے گی تب ہی میں قیصر اور شجاع کو ہاں میں جواب دوں گا۔ اور معذرت کر لوں گا۔“ نانا ابائی لہجہ بہت سنجیدہ تھا۔

”فری سے میں آج ہی پوچھ لوں گی۔“ نانی امی بہت خوش اور ایکساٹینڈ لگ رہی تھیں۔ یوں جیسے کی نواسی کے لیے عین اسی جگہ سے رشتہ آ گیا جہاں وہ چاہ رہی تھیں۔

”نہیں۔ تم بات مت کرنا۔ میں خود اس سے بات کروں گا۔ میں کسی بھی طرح اسے اس رشتے لیے پریشاں نہیں کرنا چاہتا۔ کہیں ایسا نہ ہو وہ یہ جان کر کہ میں اور تم اس رشتے کو بہت زیادہ پسند کر رہے ہیں محض ہماری مروت میں ہامی بھر لے۔“

نانی امی کے برخلاف ان کے انداز میں خوشی اور گرم جوشی سے زیادہ سنجیدگی اور کسی گہری سوچ اور فکر

بھٹک محسوس ہو رہی تھی۔ برسوں پہلے ایک فیصلہ انہوں نے خود کیا تھا اور فرماں بردار بیٹی نے ان کے اس فیصلے پر سر بھی جھکا دیا تھا لیکن پھر وہ جھکا ہوا سر زیادہ عرصہ جھکا نہیں رہا تھا۔ وہ سرتن کر ان کے بالکل سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ ان کے ہر فیصلے کو ماننے سے انکار کرتے ہوئے۔ شاید اسی لیے اب وہ کوئی فیصلہ خود کرنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ دونوں اس کی آمد سے بے خبر آپس میں اسی رشتے اور شجاع انکل کی فیملی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ جب کہ وہ مردہ قدموں سے چلتی بہت الجھی ہوئی مضطرب سے انداز میں اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ گھٹے کے ساتھ ہی یونہی بے خیالی میں اس کی نظر دیوار پر لگی ماما کی تصویر پر پڑی تھی۔

”وہ وقت کتنا سخت ہوتا ہے ناں ارجمند۔ کہتے ہیں اس وقت جو دعا مانگی جائے وہ ضرور قبول ہوتی ہے۔ میں نے اس لمحہ بڑی شدت سے اللہ سے یہی دعا مانگی تھی کہ خدا یا میرے پاپا مجھے معاف کر دیں۔ میری اولاد کو میرے لیے نجات کا ذریعہ بنا دے۔ اسی کے ویلے سے مجھے میرے پاپا کی معافی مل جائے۔“

تصویر میں مسکراتی ہوئی ماما ایک دم رونے لگی تھیں۔

”پاپا مجھے معاف نہیں کرتے فری۔ ان سے کہو مجھے معاف کر دیں۔ دیکھو تو انہوں نے اپنے دل کا دروازہ کتنی مضبوطی سے بند کر رکھا ہے۔ میں برسوں سے سرتن رہی ہوں۔ مگر وہ مجھے اندر آنے کی اجازت ہی نہیں دے رہے۔ ان سے کہو ناں فری۔ کہو کہ صوفی کو اندر آنے دیں۔“

ماما زار و قطار رو رہی تھیں۔ وہ تصویر کے بالکل قریب کھڑی ہوئی خود بھی رو رہی تھی۔

”ہاں میں ان سے کہوں گی ماما۔ میں آپ کو ان سے معافی دلواؤں گی۔ آپ کی وہ معافی جو آپ ان سے مانگنا چاہتی تھیں مگر مانگ نہ سکیں وہ مجھ پر قرض ہے۔ یہ قرض میں ضرور چکاؤں گی۔“

وہ تصویر پر ہاتھ پھیرتی روتے ہوئے زیر لب بول رہی تھی۔ بہت مضبوط لہجے میں اپنے ارادوں کی ہمتی کے ساتھ۔



رات کے کھانے کے بعد نانا ابا اور نانی امی لاؤنج میں بیٹھ گئے تھے۔ وہ نانا ابا کی فرمائش پر چائے پینے کی بجائے گھسی ہوئی۔ چائے بنانے کے دوران وہ خود کو مضبوطی کا سبق یاد کرتی رہی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ شاید چائے پینے کے دوران وہ اس سے اس بارے میں بات کریں گے۔

وہ ٹرے اٹھائے لاؤنج میں آئی تو نانا ابائی وی پر حالات حاضرہ کا کوئی پروگرام دیکھنے میں مصروف تھے۔ نانی امی کی نگاہیں بھی ٹی وی کی طرف تھیں مگر ان کا کچھ خاص انٹرسٹ نظر نہیں آ رہا تھا پروگرام میں۔ اسے آتا دیکھ کر نانا ابانے ٹی وی کی آواز کم کی۔ ان دونوں کے ہاتھ میں کپ پکڑانے کے بعد نانا اباکے برابر میں ہی بیٹھ گئی۔

”تم چائے نہیں پیو گی؟“ نانی امی نے پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلادیا۔

”آج کے اخبار میں حمزہ کا آرٹیکل پڑھا تم نے۔“ چائے کا سپ لیتے ہوئے نانا ابانے اس سے پوچھا۔

”جی صبح ہی پڑھ لیا تھا اور پڑھ کر ہمیشہ کی طرح ٹھنڈی آہ بھری تھی کہ میرے پاس اس کے جتنی غیر معمولی ذہانت اور اتنی زبردست معلومات کیوں نہیں ہیں۔“ وہ اس کے جیس سے انداز پر مسکرائے۔

”اس غیر معمولی ذہن اور زبردست معلومات رکھنے والے بندے نے تمہیں پرپوز کیا ہے۔“

انہوں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنے طور پر اسے چونکا ناچا ہاتھا۔ اگر وہ اس بات سے پہلے سے آگاہ نہ ہوتی تو اس وقت کسی بھی طرح ان کی زیرک اور تیز نگاہوں سے اپنے ان تاثرات کو چھپا نہیں سکتی تھی جو شام میں یہ خبر سننے پر اس کے چہرے پر چھائے تھے۔ چہرے پر مصنوعی حیرت تو خیر اس نے ابھی بھی طاری کی تھی۔ ایک دم سے یوں چونکی تھی جیسے کوئی بڑی غیر متوقع بات سن لی ہو۔ مگر اس حیرانی اور اچنبھے میں دکھ درد کا کوئی رنگ شامل نہیں تھا۔ حیرت بھری نگاہوں سے وہ ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ نانا اباس کے متعجب سے انداز کو بغور دیکھتے ہوئے مزید گویا ہوئے۔

”شام میں قیصر کا فون آیا تھا۔ اس نے مجھ سے تمہارے اور حمزہ کے رشتے کے بارے میں بات کی شجاع اور نازیہ کو تم بہت پسند ہو۔ وہ لوگ تمہیں اپنی بہو بنانا چاہتے ہیں۔ میں نے انہیں کوئی جواب نہیں دیا۔ تمہاری مرضی اور تمہاری پسند ناپسند میرے اور تمہاری نانی امی کے لیے ہر چیز سے بڑھ کر ہے۔ لہذا ہچکچائے اور کوئی بھی دوسری بات سوچے تم مجھے اپنی مرضی بتاؤ۔ اگر تمہاری وہاں مرضی نہیں تو میں انہیں انکار کر دوں گا۔“

وہ خاموشی سے سر جھکائے ان کی بات سن رہی تھی۔

”آرام سے سوچ سچھ لو۔ حمزہ سے تم ملی ہوئی ہو۔ تمہیں پتا ہے وہ کیسا ہے۔ اگر وہ تمہیں پسند نہیں تو بالکل کھل کر اپنی ناپسندیدگی کا بتا دو۔ یہ مت سوچنا کہ اگر میں نے منع کیا تو نانا ابیا اور نانی امی ناراض

ہو جائیں گے۔“

وہ اس کے کندھے کے گرد محبت سے ہاتھ رکھتے ہوئے رسائیت سے بولے۔

”آپ لوگوں کو ابھی سے میری شادی کی جلدی کیوں پڑ گئی۔“ وہ سر جھکائے شکایتی انداز میں بولی۔
نانا ابا اس کے شکوہ پر ہولے سے ہنسے۔

”شادی کی کوئی جلدی نہیں ہے بیٹا۔ ایک اچھا رشتہ آیا تو ہم لوگوں نے اس کے بارے میں تمہیں بتایا اور پھر شادی کبھی نہ کبھی تو ہونی ہی ہوتی ہے۔ کیا حرج ہے ہم لوگ آج اس بارے میں کھل کر آپس میں بات کر لیں۔ اگر تمہاری کوئی پسند ہے تو وہ تم ہمیں بتادو۔ یا یہ کہ تمہاری کہیں کوئی پسند فی الحال نہیں لیکن تمہارے بارے میں تم پھر بھی اس حوالے سے سوچنا نہیں چاہتے تو بھی بتادو۔ یہ ضروری تو نہیں کہ جلا داد اور خراش قسم کا نانا بنا رہوں اور تم مظلوم اور معصوم سی نواسی۔ میں چاہتا ہوں اس موضوع پر ہم دوستوں کی طرح آپس میں بات کریں۔ ہمارے درمیان کسی قسم کا کیونٹی کیشن گیپ نہ ہو۔“

نانی امی چائے پیتی خاموشی سے ان دونوں کی باتیں سن رہی تھیں۔

”میں آپ سے دوستوں کی طرح بات کر سکتی ہوں نانا ابا؟“ اس نے جیسے کچھ کہنے سے قبل اجازت طلب کی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے اس کا شانہ تھپتھا کر اجازت دی۔

”آپ مجھ سے میری مرضی اور میری پسند کی بات پوچھ رہے ہیں نانا ابا۔ اپنے لیے آنرز میں داخلے کے وقت مضمون پسند کرنا تک تو مجھے آیا نہیں تھا۔ آپ کے مشورے پر M.C ڈیپارٹمنٹ میں داخلہ لیا تھا میں نے۔ جو لڑکی اتنی سی بات کا فیصلہ خود نہ کر سکتی ہو وہ کسی کو شادی کے لیے پسند یا ناپسند کرنے جتنا بڑا فیصلہ خود کیسے کر سکتی ہے۔ میں تو ہر چیز کو ابھی تک آپ کی نگاہوں سے دیکھتی ہوں اور مجھے اس چیز پر کوئی انسوس بھی نہیں۔ اس عمر میں مجھ میں جتنی سوجھ بوجھ اور سمجھ ہونی چاہیے وہ مجھ میں ہے۔ جب میرے سر پر میرے بڑے موجود ہیں جو مجھ سے بہت بہتر انداز میں میرا برا بھلا سوچ سکتے ہیں تو مجھے بلاوجہ خود کو الجھانے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنے لیے خود تو وہ لڑکیاں سوچتی ہیں جن کے لیے کوئی سوچنے والا نہیں ہوتا۔ میں کوئی لاوارث تو نہیں جو اپنی زندگی کے فیصلے خود کرتی پھروں۔ میرے لیے سوچنے اور فیصلہ کرنے والے اللہ کا شکر ہے، موجود ہیں۔ اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ مجھ سے کس قدر محبت کرتے ہیں۔ اتنی محبت کہ شاید اتنی محبت میں خود اپنے آپ سے نہیں کرتی۔ میں خود اپنے لیے کچھ غلط سوچ سکتی ہوں، کر سکتی ہوں مگر وہ کبھی نہیں۔“

اس نے ان کے کندھے پر اپنا سر ٹکا دیا۔ وہ پیار بھرے انداز میں اس کے ہاتھ تھامے ہوئے تھے۔ نالی امی کے چہرے پر خوشی اور طمانیت سے بھرپور مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

”شجاع اور ناز یہ تو خیر اچھے ہیں ہی۔ لیکن حمزہ وہ بھی بہت اچھا ہے فری۔ اس عمر میں لڑکے عموماً اتنے میچور ہوتے نہیں ہیں جتنا وہ ہے۔ تم وہاں بہت خوش رہو گی۔“

اتنی دیر کی خاموشی کے بعد نالی امی نے پہلی مرتبہ اس کے سامنے اپنی رائے ظاہر کی تھی۔

”نانا ابا جس کو اچھا کہہ دیں وہ برا ہو بھی کیسے سکتا ہے۔“ وہ اسی طرح ان کے کندھے پر سر نکالے شوخی سے بولی۔ نانا ابا ان کمنٹس پر مسکرائے۔

”ان تعریفی کلمات کے لیے بہت شکریہ۔ لیکن میں چاہتا ہوں مس فریہ عبدالرحمن کہ اب آپ بھی ذرا بڑی ہو جائیں۔ اپنے طور پر لوگوں کو سمجھنا سیکھیں۔ ضروری نہیں جسے میں اچھا کہہ رہا ہوں وہ واقعی اچھا ہے بھی۔ کبھی میں غلط بھی تو ہو سکتا ہوں۔ اختلاف کرنا سیکھیں۔ چاہے سامنے کوئی بھی ہو۔“

نانا ابا نے پیار بھرے انداز میں اسے سرزنش کی پھر جب وہ کچھ دیر بعد اپنے کمرے میں آ کر لیٹی تو نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ کروٹیں بدلتی وہ خود کو کسی بھی قسم کی سوچوں میں الجھائے بغیر ایک پرسکون نیند کی متمنی تھی لیکن پتا نہیں کیا ہو رہا تھا جیسے ہی وہ سونے کے ارادے سے آنکھیں بند کرتی چھم۔۔۔ آنکھوں کے سامنے کوئی پرانا منظر آ کر کھڑا ہو جاتا۔

”اس گھر میں ایک بار بی ڈول رہتی ہے مجھے اس سے ملنا ہے۔“

”تمہاری کینڈی واقعی خوبصورت ہے بالکل تمہاری طرح۔“

وہ گھبرا کر آنکھیں کھول دیتی تو وہ منظر غائب ہو جاتا۔ بہت دیر وہ اپنے منتشر ہوتے اعصاب پر سکون کرنے کی کوشش کرتی رہتی پھر کافی دیر بعد جب خود کو مطمئن پا کر دوبارہ آنکھیں بند کرتی تو ایک مرتبہ بچہ ماضی کا کوئی لمحہ کوئی آواز کوئی مانوس لہجہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا۔

”سعد! تم بڑے ہو کر کیا کاربینٹر بنو گے؟“ اپنے گھر کے کورٹ یارڈ میں لکڑیوں کے ساتھ ٹھونکا بیڑ

کرتے سعد سے اس نے بڑی سنجیدگی اور بردباری سے دریافت کیا تھا۔ وہ سامنے موجود کتاب میز

دیے ہوئے طریقے پر غور کرتا انچز (Inches) اور فٹس (Fits) کا حساب کتاب کرتا لکڑی کے مختلف

سائز کے ٹکڑے جوڑنے میں مصروف تھا۔ اس کے یہ کہنے پر کہ وہ کینڈی کے لیے ایک پیارا سا گھر بنا

چاہتی ہے۔ وہ پتا نہیں کہاں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک کتاب لے آیا تھا جس میں پالتو بلیوں کے لیے ان

کے رنگ، نسل اور عمر وغیرہ کے حساب سے رہائش کا بندوبست کرنے کا طریقہ مفصل سمجھایا گیا تھا۔ وہ بھی ایگزام اور فنٹ اور انچوں میں دی گئی پیمائش کے ساتھ۔

”کہنے کو تم یہ بھی کہہ سکتی تھیں کہ سعد تم کیا بڑے ہو کر انجینئر بنو گے۔ لیکن خیر یہ پروفیشن بھی کچھ برا نہیں۔ بڑی کمائی ہوتی ہے کارپینٹرز کی۔“

وہ اس وقت اگر دس سال کی تھی تو سعد بارہ سال کا۔ اور اس عمر کے وہ بچے اسی قسم کی باتیں کر سکتے تھے اور ایسی ہی سرگرمیوں میں لگن ہو سکتے تھے۔

کتنے دنوں کی محنت کے بعد کینڈی کا گھرانہ دونوں نے مل کر تیار کیا تھا۔ ثانی امی ان دونوں کی اس حرکت پر ہنسنے کے ساتھ ساتھ سعد کو اس کی ہنرمندی پر شاباش بھی دیا کرتی تھیں۔ کینڈی مرگئی۔ وہ وقت ہی گزر گیا مگر وہ یادیں تو آج بھی اس کے ساتھ تھیں۔

وہ گرمی اور دھوپ سے بے نیاز ساری ساری دوپہر کورٹ یارڈ میں گزارنا۔

”میں سوچ رہا تھا تمہیں ان چھٹیوں میں اسکیننگ کرنی سکھاؤں گا۔“

”بھائی! بہت مہینوں سے اپنی پاگٹ منی میں سے پیسے بچا رہا تھا۔ تاکہ تمہیں سا لگرہ پر دینے کے لیے Skator خرید سکے۔“

زوہیب نے اس کے اسکیننگ کی مشق کے لیے سعد کے گھر آنے پر ایک روز بتایا تھا۔ وہ اس بات پر بہت خوش ہوئی تھی۔ وہ اتنے پہلے سے اس کی سا لگرہ کو یاد رکھے ہوئے تھا۔

”بھائی کے بہت سارے دوست ہیں۔ لیکن تمہاری بات الگ ہے۔ تم تو اس کی سب سے خاص دوست ہو۔ دیکھا نہیں تھا اس روز کیسا تمہیں دیکھتے ہی اس نے فوراً تمہلکے کا بہانہ بنا کر میرے ساتھ پلانٹن کھیلنے سے انکار کر دیا تھا۔“

اپنے گھر کی اسٹڈی میں بیٹھا زوہیب ہوم ورک کرتا ہوا اس سے مخاطب ہوا تھا۔ سعد اس وقت اسٹڈی میں نہیں تھا۔ اس کے کسی دوست کا فون آیا ہوا تھا اور وہ اس بات پر کچھ چڑ کر زوہیب سے سعد کے ڈھیر سارے دوستوں کے بارے میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر رہی تھی۔

”میرا بہترین دوست سعد منیر۔“ خود بخود اس کے لبوں سے یہ جملہ نکلا تھا اور پتا نہیں کیوں پھر وہ ساری رات بے آواز روتی رہی تھی۔

صبح فجر کے وقت ابھی وہ واش روم سے وضو کر کے نکلی ہی تھی کہ فون کی بیل بجی تھی۔ نانا بابا ابھی ابھی نماز

پڑھنے کے لیے مسجد روانہ ہوئے تھے۔ نانی امی بھی یقیناً اپنے کمرے میں کچھ پڑھنے پڑھانے ہی
مصرف تھیں۔ وہ اتنی صبح فون کی بیل بجنے پر ڈرگئی تھی۔

”اللہ خیر کرے اتنی صبح کس کا فون آ گیا۔“ وہ ٹیلی فون کے پاس آئی تو سعد کا فون نمبر دیکھ کر
ڈرگئی۔ دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے ریسیور اٹھایا۔

”فری اتم ٹھیک ہو۔“ وہ بغیر سلام دعا کے اس کے ہیلو کے جواب میں بے تابانہ انداز میں پوچھ رہا
وہ اس کے بے قرار اور مضطرب سے انداز میں پوچھے گئے سوال پر ایک پل کے لیے بے تحاشا حیرت
ہوئی۔

”ہاں بالکل ٹھیک ہوں۔ اتنی صبح صبح تم نے یہ سوال پوچھنے کے لیے فون کیا ہے؟“ اس نے بہت
سے پوچھا۔

وہ اس کے سوال کے جواب میں کچھ بولے بغیر صرف ایک گہری طمانیت بھری سانس لے کر باہر
خاموش تھا۔

”اتنی صبح فون کی بیل ہونے پر میں ڈرگئی۔ میری خیریت چند گھنٹوں بعد بھی تو پوچھی جاسکتی تھی
تمہیں یہ لگ رہا تھا کہ کل گول گپے کھا کر آج میں لازمی بیمار پڑی ہوئی ہوں گی۔ چنانچہ میری خیر
دریافت کرنا اور وہ بھی منہ اندھیرے تم نے اپنا اخلاقی فرض سمجھا۔“

وہ اپنے مخصوص بے تکلفانہ انداز میں اس سے مخاطب تھی۔ وہ اس کی بات سن کر دھیمی سی ہنسی ہنسا۔
یہ ہنسی بڑی سنجیدہ سی تھی۔ اس میں وہ شوخی اور شرارت کہیں محسوس نہیں ہو رہی تھی جو ہمیشہ ہوا کرتی تھی۔
”پتا نہیں آج کیا ہوا فری! حالانکہ ایسے زمانہ قسم کے وہم میں کرتا بھی نہیں ہوں۔ مجھے خود سمجھ میں
آ رہا۔ رات میں نے اتنا برا خواب دیکھا۔ اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ پھر ساری رات مجھے نیند
نہیں آئی۔ دل چاہ رہا تھا اسی وقت تمہیں فون کروں۔ ایسا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا فری! میں خود
آپ پر حیران ہوں۔ مجھے ہو کیا رہا تھا۔ بس پھر ساری رات جاگتا میں صبح ہونے کا انتظار کرتا رہا۔“

وہ جیسے خود اپنے آپ پر جھنجھایا ہوا اور زچ سا تھا۔ وہ حیرت سے گنگ اس کی بات سن رہی تھی۔
”کیا خواب دیکھا تھا۔ سعد؟“ اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔

”بہت برا خواب تھا فری! میں تمہیں سناؤں گا نہیں۔ برے خواب کسی کو بھی سنانے نہیں چاہئیں۔
اس کے بعد میں اتنا پریشان ہوا کہ تمہیں بتانا نہیں سکتا۔ پھر ایک پل کے لیے بھی مجھے نیند نہیں آئی۔“

وہ بڑی سے بڑی بات کو بھی سرسری سے انداز میں لینے والا سعد اس وقت ایک معمولی سے خواب پر انتہائی پریشان اور متفکر تھا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں سعد! تمہیں میری آواز سے نہیں لگ رہا۔“

ریسیور اس کے ہاتھوں میں کانپ رہا تھا۔ آنکھیں کسی بھی لمحہ جھلک پڑنے کو بے تاب تھیں مگر وہ لہجے میں بشارت اور تازگی سمونے ہوئے اسے مطمئن کر رہی تھی۔ اور وہ اس کے جواب سے مطمئن ہو بھی گیا تھا۔ کچھ دیر بعد نماز پڑھ کر جب اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو بے اختیار اللہ سے مدد چاہی تھی۔

”یا اللہ مجھے مضبوطی اور ثابت قدمی عطا فرما۔ میں کسی بھی لمحہ کہیں پر بھی کمزور نہ پڑوں۔“ آنکھوں سے تو اتارے آنسو بہ رہے تھے۔

دوپہر میں یونیورسٹی سے آ کر جب وہ نانی امی کے ساتھ بیٹھی کھانا کھا رہی تھی اس وقت انہوں نے بڑے خوشگوار انداز میں اسے نانا ابا کی شجاع انکل کے گھر کی جانے والی فون کال کا بتایا تھا۔

”تمہارے نانا ابا بہت خوش ہیں اس رشتے پر۔ کہتے ہیں اس سے اچھا رشتہ فری کے لیے اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ ادھر تم یونیورسٹی کے لیے نکلیں ادھر انہوں نے ناشتے سے فارغ ہوتے ہی اسلام آباد فون کر دیا۔ یہاں سے اقرار سننے کے بعد وہاں بھی کم و بیش سب کا یہی حال ہے۔ شجاع سے میری بھی بات ہوئی تھی۔ بہت زیادہ خوش لگ رہا تھا وہ۔“

نانی امی کی کھلتی ہوئی خوشی سے بھر پور آواز اسے اندر تک سرشار کر گئی تھی۔ وہ خوشیاں جو اس گھر سے روٹھ گئی تھیں برسوں بعد لوٹ کر آئے تو تھیں۔

”وہ لوگ کہہ رہے تھے ایک دو روز میں گراچی آ کر باقاعدہ کوئی رسم وغیرہ کرنے کو۔ نازیہ کہہ رہی تھی خالی فون پر رشتہ طے کرنے میں بھی کوئی مزہ ہے۔ کم از کم ہم لوگ فریا کو اپنے ہاتھ سے انگوشی تو پہنائیں۔ اس خوشی کو مل کر منائیں۔ ظاہری بات ہے حزرہ اکلوتا بیٹا ہے اس کا۔ جتنے ارمان نہ ہوں اس کے دل میں کم ہے۔ اس دن کا تو ہر ماں باپ کو انتظار ہوتا ہے۔“

وہ پیار بھری نگاہیں اس کے چہرے پر دکھائے اسے فون پر ہونے والی گفتگو کی تفصیلات سنارہی تھیں۔ شام میں نانا ابا کے چہرے پر بھی وہی خوشگوار سی مسکراہٹ دکھی تھی اس نے جو دوپہر سے نانی امی کے چہرے پر دیکھ رہی تھی۔

”آپ لوگ اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی کی خوشی نہیں مناسکتے تھے۔ اس نے آپ لوگوں سے خوش ہونے کا

وہ حق ہی چھین لیا تھا۔ کیسا دل تڑپا ہوگا اس ماں کا۔ جس نے اپنی بیٹی کی شادی کی کوئی تیاریاں نہیں کیں۔ بازاروں کے چکر نہیں لگائے۔ گھر گھر جا کر کارڈز تقسیم نہیں کیے۔ بیٹی کو مایوں نہیں بٹھایا، اس کی مہندی نہیں سجائی۔ اس کے گھر میں ڈھولک کی آواز نہیں گونجی۔ سکھیوں نے گیت نہیں گائے۔ گھر کو روشنیوں سے نہیں سجایا بلکہ ان سب کے برخلاف بیٹی ماں باپ کے گلے لگے بنا دعائیں لیے بغیر چند لوگوں کی موجودگی میں باپ کی گھر سے رخصت ہو گئی۔ وہ سب خوشیاں آپ کو میں ضرور لوٹاؤں گی۔ وہ شخص جسے آپ نے اپنی لاڈلی بیٹی کے لیے پسند کیا تھا اور جسے آپ آج بھی اسی حوالے سے پسند کرتے ہیں کہ یہ بہترین انسان میں نے اپنی بیٹی کے لیے منتخب کیا تھا۔ آج اسی کا بیٹا آپ نے میرے لیے چنا ہے اور آپ کا یہ چناؤ مجھے دل و جان سے قبول ہے۔“

نانا ابا کے مسکراتے چہرے کو اپنی نظروں کی گرفت میں لیے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔ نانا ابا اس کی نگاہوں سے بے نیاز نانی امی کے ساتھ اس بارے میں گفتگو کر رہے تھے کہ شجاع انگل وغیرہ کے کراچی آنے پر کس قسم کا دعوتی انتظام ہونا چاہیے۔

”کوئی باقاعدہ فنکشن نہیں بھی ہے اور کسی کو انوائٹ بھی نہیں کرنا ہے لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ زبردست قسم کا انتظام تو ضرور ہونا چاہیے۔ آخر آ تو وہ لوگ انگوٹھی پہنانے ہی رہے ہیں۔“

نانی امی نے ان سے اپنی رائے کا اظہار کیا تو انہوں نے اتفاق کرنے والے انداز میں گردن ہلا دی تھی۔ نانی امی کے ہاتھ پاؤں تو تباہ بھولے جب اسی رات شجاع انگل نے فون کر کے بتایا کہ وہ لوگ کل شام کی فلائٹ سے کراچی آرہے ہیں۔ ان لوگوں کے آنے کا سننے کے بعد تو یونیورسٹی جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یونیورسٹی سے چھٹی کر کے اس نے نانی امی کا ہاتھ بنا نا چاہا تو انہوں نے اسے کسی بھی کام کو ہاتھ لگانے سے سختی سے منع کر دیا۔ ان کی بات تو شاید وہ ان سنی کر بھی دیتی لیکن نانا ابا نے ان سے بھی زیادہ سخت انداز میں اسے کچن میں گھسنے سے منع کیا۔

”اس سے تو پھر میں یونیورسٹی ہی چلی جاتی۔ بے کار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہوں۔“ وہ جھنجھلائی۔

”کون کہہ رہا ہے تم سے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھو۔ تمہارے سسرالی آرہے ہیں کچھ اچھی اچھی سی تیاریاں کرلو۔ ایک چکر بیوٹی پارلر کا لگا آؤ۔“ نانا ابا نے شرارتی سی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے اسے چھینرا۔

سب وعدہ سر شام ہی وہ لوگ پہنچ گئے تھے۔ شجاع انکل، آنٹی، فرحین اور چھوٹے نانا کے ساتھ ساتھ مزہ بھی ان لوگوں کے ساتھ آیا تھا۔ آتنی بہت خوبصورت اور قیمتی ڈریس اس کے لیے لائی تھیں۔ فرحین نے تیاری میں اس کی مدد کی۔ بغیر کسی بیوٹی پارلر سے تیار ہوئے ہی وہ ہمیشہ سے بہت مختلف اور بہت پیاری لگ رہی تھی۔ فرحین کے ساتھ ہی وہ ڈرائنگ روم میں آ کر سب لوگوں کے درمیان بیٹھی چھوٹی سی گمریلو سطح پر منعقد کی جانے والی وہ تقریب جس سے ابھی خاندان بھر میں کسی کو آگاہ بھی نہیں کیا گیا تھا۔

ہاں موجود سب ہی لوگوں کے لیے خوشیوں اور مسکراہٹوں کا باعث تھی۔ چھوٹے نانا کے ہاتھ سے انگوٹھی پہننے کے بعد اور پھر ڈنر کے دوران بھی وہ سارا وقت سر جھکائے اور زیادہ تر خاموش ہی رہی تھی۔ کوئی براہ راست اسے مخاطب کرتا تو وہ جواب دیتی اور اس کے بعد پھر وہی خاموشی۔

حزہ کی تھوڑی تھوڑی دیر بعد خود پر پڑنے والی گہری نگاہوں کا اسے سر جھکائے ہوئے بھی اندازہ تھا۔ مزہ کے علاوہ باقی سب کارات ان کے ہاں ٹھہرنے کا پروگرام تھا۔ اس کے کچھ دفتری کام تھے جن کی وجہ سے اسے واپسی کی جلدی تھی۔ کھانے کے بعد کافی پیتے ہی وہ جانے کے لیے اٹھ گیا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ حزہ اس سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہے۔ مگر اتنے سارے بڑوں کے بیچ شاید وہ اپنی اس خواہش کا اظہار نہیں کر پارہا تھا۔

رات میں سونے سے پہلے فرحین نے اس کے اس خیال کی تصدیق بھی کر دی تھی۔

”حزہ بھائی بے چارے آپ سے بات کرنا چاہ رہے تھے۔ مگر سب کے سامنے کیا بات کرتے۔ جاتے وقت مجھ پر بھی لعنت بھیج کر گئے ہیں کہ میں بھائی کے اتنا سا بھی کام نہ آسکی۔ لیکن نہیں بھئی، میں بڑے ابا کے سامنے ایسی ویسی کوئی حرکت کر ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ کہتے یہ اتنی سی چھٹکنی کی حرکتیں دیکھو۔ بڑوں کے سامنے بھائی بھائی کی ملاقاتوں کا بندوبست کروا رہی ہے۔“

اس کے برابر بیڈ پر لیٹی وہ بڑے مزے سے نانا ابا سے خائف ہونے کا اعتراف کر رہی تھی۔ وہ نانا ابا سے اس کے ڈرنے پر ہنس پڑی تھی۔

اگلے روز دوپہر کے کھانے کے بعد ان لوگوں کی واپسی ہوئی تھی۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد اس نے سعد کو فون کرنے کا سوچا۔ وہ فون کرنے کے ارادے سے آ کر بیٹھی پھر کچھ سوچ کر ریسیور واپس رکھ دیا۔ کل سنڈے تھا۔ بجائے فون کرنے کے اس نے کل سعد کے گھر جانے کا پروگرام طے کیا۔



وہ سعد کے گھر پہنچی تو صبح کے دس بج رہے تھے۔ فخر و اسے لاؤنج میں بیٹھا کر سعد کو اٹھانے چلا گیا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد سعد کی آمد ہوئی تھی۔ آنکھوں کی سرنخی اور بوجھل پن نیند کے نامکمل ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔

”آپ کیسے تشریف لے آئیں میرے غریب خانے پر۔ وہ اچھی اردو میں ایسے موقع پر کیا شعر پڑھا جاتا ہے۔“ وہ میٹرھیوں پر سے ہی زور زور سے بولتا ہوا اس کے پاس آیا۔

”خواتنواہ ذہن پر زور نہ ڈالو۔ یہ شعر و شاعری تمہارے بس کا روگ نہیں۔ تمہاری پہنچ بس مارکیٹنگ بینکنگ، اکاؤنٹنگ اور فنانس تک ہی ہے۔ بہتر ہے تم اسی کے بارے میں غور و فکر کیا کرو۔“ وہ مذاق اڑانے والے انداز میں گویا ہوئی تھی۔ فلورکشن پر گرنے والے انداز میں بیٹھتے ہوئے اس نے اسے گھور کر دیکھا۔

”ویسے خیریت تو ہے۔ صبح نازل ہونے کی وجہ پوچھ سکتا ہوں۔“ وہ نازل ہونے کے لفظ پر برا ماننے والے لہجے میں بولی۔

”تمہیں میرا آنا اچھا نہیں لگا؟“

”اچھا برا کا فیصلہ تو بعد میں ہوگا۔ فی الحال تو میں حیران ہو رہا ہوں۔ مٹی ڈیڈی کے جانے کے بعد تم یہاں کتنی بار آئی ہو۔ میں انگلیوں پر گن کر بتا سکتا ہوں۔“ وہ صاف گوئی سے بولا۔

”ویسے آج میرا تم سے ملنے آنے کا پکا پروگرام تھا۔ پچھلے تین دن اتنا بڑی رہا کہ تم سے فون پر بھی بات نہیں ہو سکی۔ پھر آج تو سنڈے بھی ہے۔ نانی امی یقیناً لنچ پر کچھ خاص اہتمام ضرور کریں گی۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”تندوری چکن بن رہی ہے۔ آجانا تم لنچ پر۔“ اس نے اطلاع فراہم کی۔ اس کا جواب سننے کے دوران سعد نے فخر کو آواز دے کر بلایا تھا۔ اس سے اپنے لیے ناشتہ لانے کا کہتے ہوئے سعد نے اس سے بھی ناشتے کے بارے میں پوچھا۔

”ناشتہ میں کر چکی۔ ویسے تم کہو تو تمہارے لیے آج ناشتہ میں بناؤں۔“

”نیکسی اور پوچھ پوچھ۔ کچھ اچھی سی چیز بنا کر کھلا دو۔ یہ فخر و نے تو اٹنی سیدھی بد ذائقہ چیزیں کھلا کھلا کر میرے منہ کا ذائقہ ہی خراب کر دیا ہے۔“ فخر و اپنے بارے میں اتنے برے کمنٹس سن کر منہ پھلاتا وہاں سے چلا گیا۔ وہ اٹھ کر کچن میں چلی گئی تو سعد اخبار کی سرخیوں پر نظر میں دوڑانے لگا۔

”مجال ہے جو کبھی کوئی خیر کی اور دل خوش کرنے والی خبر پڑھنے کو بل جائے۔“ وہ چند لمحوں بعد ہی بیزار سا ہوتا اخبار پٹخ کر کھڑا ہو گیا۔

اس کے پاس لیکن میں آیا تو وہ تیزی سے ہاتھ چلانے میں مصروف تھی۔ وہ لیکن ٹیبل پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ ”تم کبھی میسرز اور ایجینٹس نہیں سیکھ سکتے۔ کوئی کہہ سکتا ہے یہ ٹیبل پر چڑھ کر بیٹھا ہوا بندہ کسی ایجنٹ کیٹو پوسٹ پر کام کر رہا ہے۔“ وہ مایوسی بھرے انداز میں گویا ہوئی۔

سعد نے اس کی بات ان سنی کر دی۔ اپنی کسی پسندیدہ دھن پر نوٹسنگ کرتا، وہ اسے کام کرتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اس نے ناشتہ لا کر اس کے سامنے رکھا تو وہ ٹیبل پر سے اتر کر کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

”شروع ہو جاؤ اب تم۔ جتنی دیر میں میں ناشتہ کر رہا ہوں۔ تم اپنی رام کہانی سناؤ الو۔“ وہ قہر بھرے پراٹھے سے لطف اندوز ہوتا ہوا اس سے بولا۔ اس کے چہرے پر پھیلی حیرت دیکھ کر وہ ہولے سے مسکرایا۔

”اتنی سی تمہیں تب سے تمہیں جانتا ہوں۔ تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔ جو بھی بات بتانی ہے بتا ڈالو۔“

وہ زمین سے دوڑھائی فٹ ہاتھ اوپر کرتا ہوا بولا۔ وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ نہ اس نے سعد کی بات کی تردید کی تھی نہ تائید۔

”ویسے تمہارے پاس کیا کوئی جادو کی چھڑی ہے۔ اتنی جلدی اتنا مزے دار پراٹھا کیسے تیار کر لیا تم نے۔“ وہ خود ہی موضوع بدل گیا۔

”اس میں میرا اتنا کوئی خاص کمال نہیں ہے۔ میں نے لیکن میں آ کر فریج میں جھانکا۔ تو پیالے میں بھنا ہوا قہر رکھا نظر آیا۔ بس وہ بھر کر میں نے پراٹھا بنا دیا۔“

وہ خود بھی اس کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ سعد سر ہلاتا کھانے میں مصروف ہو گیا۔ وہ ناشتہ ختم کر چکا تو دونوں اٹھ کر واپس لاؤنج میں آ گئے۔

”کل رات نانا اب سے ملاقات ہوئی تھی۔ صدیقی انکل کے گھر سے نکل رہے تھے وہ۔ میں اس وقت کاشف کے گھر جانے کے لیے نکل رہا تھا۔ بڑے خوشگوار موڈ میں تھے نانا اب۔ مجھے رات کے گیارہ بجے

گھر سے نکلتا دیکھ کر انہوں نے ٹوکا بھی نہیں۔ کوئی نصیحت اور تلقین بھی نہیں کی۔ یہ بھی نہیں کہا کہ صاحبزادے یہ وقت شریف لوگوں کی گھر واپس کا ہوتا ہے جس وقت آپ گھر سے نکل رہے ہیں۔“

حالانکہ میں انہیں دیکھ کر ڈر گیا تھا کہ اب ضرور میری کھپائی ہوگی لیکن خلاف توقع انہوں نے بڑے پرامن سے سلام کا جواب دے کر میری خیریت دریافت کی اور آگے بڑھ گئے۔“

صدیقی انکل کے ساتھ نانا ابا کی بڑی اچھی دوستی تھی۔ اکثر سیاسی موضوعات پر گفتگو کرنے ایک دوسرے کے گھر آنا جانا ہو جایا کرتا تھا۔ وہ سعد کی بات سنتے ہوئے صوفے پر ٹک گئی تھی۔

”نانا ابا آج کل خوش بہت ہیں۔ اسی خوشی میں تمہاری آوارہ گردیاں بھی نظر انداز کر گئے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

”کیا بات ہوئی ہے خوشی کی۔ مجھے بھی بتاؤ۔“ وہ آوارہ گردی کے لفظ پر برامانے بغیر خوشی کا پس منظر جاننا چاہ رہا تھا۔

”وہی تو بتانے آئی ہوں تمہیں۔ مجھے پتا ہے ساری بات جان کر تم مجھ سے بہت ناراض ہو گے۔ لیکن سب کچھ اتنا اچانک اور جلدی میں ہوا کہ میں کچھ سمجھ ہی نہیں پائی۔ کل سے تم سے بات کرنا چاہ رہی ہوں۔ لیکن گھر پر تو کل تم نے ملنا نہیں تھا۔ تم سے ملنے کے لیے تو بندہ صبح صبح گھر آئے تب ہی ملا جاسکتا ہے ورنہ نہیں اور فون پر میں نے بتانا یوں مناسب نہیں سمجھا کہ تم اتنی اہم بات بالکل غیروں کی طرح فون پر بتائے جانے پر لازمی مجھ سے ناراض ہو جاتے۔ ویسے ناراض تو تم ابھی بھی ہو گے۔ لیکن آسنے سامنے بیٹھ کر میں کم از کم اپنی صفائی تو ڈھنگ سے پیش کر سکوں گی۔“

وہ بہت سنجیدگی سے بول رہی تھی۔ سعد حیرت سے اس کی طرف دیکھتا ان الجھے ہوئے جملوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے خاموش اور تھیر سے اپنی سمت دیکھتا پا کر اس نے خوبصورت اور نازک سی ڈائمنڈ رنگ سے سجا اپنا ہاتھ اس کے آگے کر دیا تھا۔

”نانا ابا نے حمزہ کے ساتھ پرسوں میری منگنی کر دی ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے اسے بتایا۔

”تم پلیز ناراض مت ہونا سعد! سب کچھ اتنی جلدی میں ہوا۔ یقین کر ڈھم لوگوں نے کسی کو بھی انوائسٹ نہیں کیا تھا۔ ابھی تک خاندان میں بھی کسی کو اس رشتے کا پتا نہیں چلا ہے۔ بس صرف گھر کے افراد تھے اور کوئی بھی شریک نہیں تھا۔ ہر چیز اتنی اچانک اور تیز رفتاری سے ہوئی کہ میں بوکھلائے ہوئے انداز میں بس خاموشی سے سب دیکھتی ہی رہ گئی۔“

اس نے اپنی بات مکمل کر کے سعد کی طرف دیکھا تو وہ بڑے غصے سے اسے گھور رہا تھا۔

”تم صبح صبح یہ بے ہودہ مذاق کرنے کے لیے یہاں آئی ہو۔ بڑی غلطی کی تھی میں نے تمہارے سامنے

لڑہ کے بارے میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر کے۔ تمہیں پتا چل گیا ہے ناں کہ میں اس سے چڑتا ہوں۔ اس لیے جان بوجھ کر یہ فضول بکواس کر رہی ہو۔ تمہارا سٹینس آف ہیومردن بدن خراب ہوتا جا رہا ہے۔“

وہ ملا متنی لہجے میں اس انداز سے یہ بات بولا جیسے اسے سو فیصد یقین تھا اس بات کے جھوٹا ہونے پر۔
 ”میں مذاق نہیں کر رہی ہوں سعد! میری حمزہ کے ساتھ مگنی ہو گئی ہے۔ تم چاہو تو جا کر نانی امی اور نانا ابا سے تصدیق کر آؤ۔“ وہ اس کے یقین نہ کرنے پر زچ سی ہو گئی۔

اب کی بار سعد نے بہت چونک کر اسے دیکھا تھا۔
 ”تم جھوٹ بول رہی ہو ناں فری! یونہی میرے ساتھ مذاق کر رہی ہو۔“ وہ سامنے والے صوفے سے اٹھ کر اس کے بالکل سامنے کا ریٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔
 ”میں نہ جھوٹ بول رہی ہوں نہ مذاق کر رہی ہوں۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں سعد! کیا کوئی لڑکی اس طرح کی بات مذاق میں کر سکتی ہے۔“

وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بردباری سے بولی تھی۔ سعد خاموشی سے اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔
 کتنے بہت سے پل خاموشی کی نذر ہو گئے تھے۔ وہ اس کی خاموشی سے خائف سی ہوتی خود ہی بولنا شروع ہو گئی۔

”اس روز جب میں تمہارے ساتھ شاپنگ کر کے واپس آئی تو شجاع انکل کا فون آیا ہوا تھا۔ انہوں نے نانا ابا سے میرے اور حمزہ کے رشتے کے بارے میں بات کی۔ نانا ابا تو تمہیں پتا ہی ہے وہ حمزہ کو کس قدر پسند کرتے ہیں۔ انہیں رشتہ دل و جان سے قبول تھا۔ رات میں انہوں نے اس بارے میں مجھ سے پوچھا تھا۔ میں کیوں انکار کرتی۔ میری کہیں کسی کے ساتھ کوئی کنٹنٹ نہیں، میں کسی کو پسند نہیں کرتی تو پھر کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ جسے نانا ابا پسند کر رہے ہیں، میں اسے قبول کر لوں۔“

وہ اب بھی کچھ نہیں بولا تھا۔ بس خالی خالی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اسے اس چپ سے وحشت ہو رہی تھی۔ ”کیا ہو گیا ہے تمہیں سعد! تم اس طرح خاموش کیوں ہو گئے ہو۔“

”کیا تمہیں نہیں پتا مجھے کیا ہوا ہے؟“ اس کے سوال کے جواب میں اس نے بڑے عجیب سے انداز میں سوال پوچھا تھا۔ ”کسی اور کے نام کی انگوٹھی پہن کر تم اتنے فخریہ انداز میں گردن اونچی کیے میرے سامنے بیٹھی ہو۔ تمہیں یہ بات بتاتے ہوئے شرم بھی نہیں آ رہی۔ نانا ابا کو تمہاری مگنی اور شادی کا اتنا ہی

شوق اور جلدی ہو رہی تھی تو تم مجھے بتا تو سکتی تھیں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا ناں مہی کے پاکستان آنے کا۔ انہیں یہاں اسی لیے آنا تھا۔ میں نے ہی کہا تھا ان سے آنے کو۔ تم یہ بات مجھے بتاتیں۔ میں ان سے کہتا۔ وہ فوراً نہ بھی آ پائیں کم از کم فون پر ہی نانا ابا سے بات کر لیتیں۔“ وہ اب غصے سے اس کے اوپر چیخ رہا تھا۔

”کیسی باتیں کر رہے ہو تم سعد! ہماری دوستی میں ایسی کوئی بات تو کبھی بھی شامل نہیں رہی۔ میں نے تو ہمیشہ اپنی دوستوں کو بڑے فخر سے بتایا ہے۔ میری اور سعد کی دوستی بڑی صاف ستھری اور پاکیزہ ہے۔ ضروری تو نہیں کہ ایک لڑکا اور لڑکی جب آپس میں دوستی کریں تو ان کے درمیان کوئی دوسرا رشتہ بھی پیدا ہو۔ اگر ایسی کوئی بات کبھی تمہارے ذہن میں آئی بھی ہے تو کم از کم میرے تو ہرگز۔“

سعد نے اچانک اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ کر اسے آگے بولنے سے روک دیا۔ ”آگے کچھ مت کہنا فری۔ پلیز اس سے آگے کچھ مت کہنا۔ بس صرف اتنی سی بات ہے ناں کہ فریا عبدالرحمان اپنی زندگی کا سفر سعد منیر کے ساتھ طے نہیں کرنا چاہتی۔ وہ کوئی اور ہے جس کے ساتھ اس نے زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا ہے۔ تمہارا یہ فیصلہ میں نے سن لیا۔ اتنی سی بات بتانے کے لیے اتنے آگے تک تو مت جاؤ۔ یہ مت کہو کہ محبت کے اس سفر میں میں تنہا تھا۔ میں تمہیں اقرار کے لیے مجبور نہیں کرتا میں تمہیں کسی بھی بات کے لیے مجبور نہیں کرتا لیکن پلیز فری! یہ کبھی مت کہنا کہ سعد منیر! محبت کا یہ سفر تم نے تنہا طے کیا ہے۔ میں اس سفر میں کبھی تمہارے ساتھ تھی بھی نہیں۔ یہ بات میں سہہ نہیں پاؤں گا فری! میں تمہاری جدائی سہہ سکتا ہوں میں ہر بات سہہ سکتا ہوں مگر یہ نہیں۔“

یہ ٹوٹا بکھرا لہجہ سعد کا لگ ہی نہیں رہا تھا۔ سعد نے اپنا ہاتھ اس کے لبوں پر سے ہٹا لیا۔ وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ اس وقت کہیں بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نہیں گر رہے تھے۔ لیکن وہ پھر بھی روتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ کیا کبھی مرد روتے بھی ہیں؟

اچانک وہ اس کے سامنے سے اٹھ گیا۔ وہ صوفے پر سکتے کے سے عالم میں بیٹھی اسے لاؤنج سے نکلتا ہوا دیکھتی رہ گئی اور وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گیا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ بھی بڑی خاموشی سے وہاں سے نکل کر واپس اپنے گھر آ گئی تھی۔

”بتا دیا سعد کو منگنی کا؟“ کچن میں مصروف نانی امی نے اسے دیکھتے ہی پوچھا تھا۔

”جی بتا دیا۔ فی الحال تو موصوف مجھ سے سخت ناراض ہو گئے ہیں۔“ فرنگ میں سے پانی نکالتے ہوئے

اس نے انہیں بتایا۔

”اس کا ناراض ہونا بھی اپنی جگہ جائز ہے۔“ نانی امی نے کینیڈا میں سے کچھ ڈھونڈتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا، وہ سر ہلاتی کچن سے نکل گئی۔ اپنے کمرے میں آ کر تھوڑی دیر تک تو وہ یونہی بیٹھی رہی۔ ننت ترین گھٹن اور اعصابی دباؤ کا شکار ہو رہی تھی وہ اس وقت۔ جو کچھ اس وقت اس کے دل میں تھا وہ جب تک باہر نہ نکل جاتا اس وقت تک اس کا اضطراب کم نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی ڈائری نہیں لکھی تھی۔ لیکن اس وقت وہ ڈائری کے ساتھ اپنی تمام تر فیملنگز شیئر کرنا چاہتی تھی۔

اس نے اٹھ کر الماری کھولی تھی۔ ماما کی سب سے آخری ڈائری جس کے تقریباً آدھے صفحے خالی پڑے تھے اس نے نکال لی تھی۔ ماما نے آخری روز ڈائری تب لکھی تھی جب وہ پاکستان ٹور سے واپس آئی تھیں۔ اس میں اس کے پاپا سے والہانہ چاہت کا اظہار کیا گیا تھا۔

اس کے بعد کے تمام واقعات کے بارے میں انہوں نے ایک لفظ بھی نہیں لکھا تھا۔ شاید ان دنوں ان کا ذہن اتنا الجھا ہوا ہو گا کہ وہ کچھ لکھ ہی نہ پائی ہوں گی۔ کافی دیر تک بیٹھی وہ لکھتی رہی تھی۔ ہر وہ بات جو اس کے دل میں اس وقت شور مچا رہی تھی۔ اس نے لکھ ڈالی تھی۔ ایسا کرنے سے اسے بڑا سکون اور اطمینان ملا تھا۔ کچھ دیر پہلے کا اضطراب اور بے چینی آہستہ آہستہ ختم ہوتے جا رہے تھے۔



رات میں حمزہ کا فون آیا تھا۔ نانی امی ریسیور اس کے ہاتھ میں پکڑا کر خود لاؤنج سے چلی گئی تھیں۔

”کیسی ہو؟“ اس کا وہی دوستانہ سا انداز تھا خیریت پوچھنے کا۔

”بالکل ٹھیک۔ تم کیسے ہو۔“ اس نے بھی جواباً خیریت پوچھی۔

”ٹھیک ٹھاک اور بے تحاشا خوش۔ اتنا خوش کہ مارے خوشی کے ہر کام الٹا کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے اس وقت تم سے بات کرنے کے علاوہ میں دوسرا کوئی بھی کام ڈھنگ سے نہیں کر سکتا۔“ وہ بڑے بے تکلفانہ اور خوشگوار موڈ میں تھا۔

وہ جواباً خاموش رہی۔

”ویسے تم اس وقت کر کیا رہی تھیں۔ میں نے ڈسٹرب تو نہیں کر دیا۔“

”نہیں۔ میں بالکل بھی ڈسٹرب نہیں ہوئی۔“ اس نے سنجیدگی سے حمزہ کی بات کا جواب دیا۔

”تمہیں کیسا لگ رہا ہے فریڈا! اس نئے رشتے کے بعد مجھ سے بات کرنا۔“ اس کی بات سننے کے بعد

اس نے آہستگی سے پوچھا۔

”اب تم روایتی مشرقی لڑکیوں کی طرح شرمناک مت شروع کر دینا۔ ویسے اتنا تو مجھے اندازہ ہے کہ تم نے میرے بارے میں کبھی اس انداز سے نہیں سوچا تھا۔ تمہارے لیے میں ایک عام سا کزن تھا۔ اتمہارے لیے میری کوئی اہمیت تھی بھی تو وہ میرے پروفیشن کے حوالے سے تھی۔ شاید کچھ ذہین اور جینس ٹائپ کا بندہ لگا تھا میں تمہیں۔“

وہ ایک سیکنڈ اس کے جواب کا انتظار کرنے کے بعد خود ہی جواب دینا شروع ہو گیا۔ وہ حمزہ کی بات سن کر ہنس پڑی۔

”ہاں اس سے زیادہ واقعی میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔“ اس نے تھوڑی سی صاف گوئی سے کام لیا۔ وہ اس کے جواب سے محظوظ ہوتا ہنس پڑا۔

”کیا میں یہ امید کر سکتا ہوں کہ مس فریاء عبدالرحمان اب میرے بارے میں کچھ مختلف انداز سے سوچنا شروع کر دیں گی۔ ذہانتوں اور صلاحیتوں سے ہٹ کر۔ اس حمزہ شجاع احمد کے بارے میں جو فریاء نام کی اس لڑکی کے پیچھے واقعی پاگل ہو چکا ہے۔“

حمزہ سے اس درجہ بے تکلفی کی امید اسے قطعاً نہیں تھی۔ اس کے واضح اظہار کے جواب میں اسے کیا کہنا چاہیے اسے یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”تین چار سال پہلے ڈیڈی نے ایک بار میرے اور مئی کے سامنے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔ تب میں نے ان کی بات پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ اول تو اس وقت میں اپنی پڑھائی میں مصروف تھا۔ دوسرے ایک ایسی کزن جسے بچپن کے بعد میں نے دوبارہ کبھی دیکھا تک نہیں اس کے بارے میں سوچنا میں نے کچھ ضروری نہیں سمجھا تھا۔ لیکن پھر جب میں کراچی ڈیڈی کے ساتھ آیا اور تم سے ملاقات ہوئی تو یقین کرو پہلی نظر میں ہی تم مجھے بہت اچھی لگی تھیں۔ پہلے پہل شاید میں تمہاری خوبصورتی سے متاثر ہوا تھا۔ لیکن پھر جیسے جیسے میں تم سے ملتا گیا ویسے ویسے تمہاری بہت سی خوبیاں میرے سامنے آتی چلی گئیں۔“

تب میں نے یہ بات جانی کہ فریاء عبدالرحمان کی صورت جتنی دلکش اور خوبصورت ہے۔ اس کا دل اس سے بھی بڑھ کر خوبصورت ہے۔ اچھی شکل صورت اللہ کا انعام ہے، کسی بھی انسان کی ایک اضافی خوبی۔ لیکن اس خوبی میں اس کا اپنا کوئی کمال نہیں ہوتا۔ وہ اچھی شکل بغیر کسی محنت اور کوشش کے اسے مل جاتی ہے۔ لیکن جس کا دل خوب صورت ہو، جس کی سوچ خوبصورت ہو، درحقیقت تو وہی انسان خوبصورت ہوتا

ہے اور تمہارے پاس یہ خوبصورتی موجود ہے۔“

وہ بہت اپنائیت بھرے انداز میں اس سے مخاطب تھا۔ وہ خاموشی سے اسے بولتا سن رہی تھی۔

”اس روز جب ہم سی ویو گئے تو میں نے تمہاری بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ اس وقت میرے پاس جواب نہیں تھا۔ جواب تھا میرے پاس۔ لیکن میں یہ سوچ کر کہہیں تم اسے میری ضرورت سے زیادہ بے تکلفی اور بے باکی سمجھ کر برانہ مان جاؤ خاموش ہو گیا تھا۔ بات یہ ہے فریا کہ تمہارے بارے میں کوئی بھی اندازہ اور کوئی بھی رائے میں نے تمہارا کوئی آرٹیکل پڑھ کر قائم نہیں کی۔ ضروری نہیں کہ جو الفاظ بڑی حساسیت اور درد مندی لیے ہوئے ہوں انہیں تخلیق کرنے والی شخصیت بھی اتنی ہی حساس اور درد مند ہو۔ صرف کسی کی تحریر پڑھ کر ہم اس کے بارے میں کوئی رائے کیسے قائم کر سکتے ہیں۔ تمہارا آرٹیکل پڑھتے ہوئے تو میں صرف یہ سوچتا رہا تھا کہ ہاں یہ لڑکی اس کے لفظ جتنے خوبصورت ہیں اس کا دل اس سے بھی بڑھ کر خوبصورت ہے۔“ تم دل سے سوچتی ہو۔“ یہ بات اگر میں نے تم سے کہی تھی تو تمہیں بہت قریب سے دیکھنے اور جاننے کے بعد کہی تھی اور میں تمہیں بتاؤں فریا کہ تمہارا دل سے سوچنا ہی درحقیقت مجھ سے اتنا بڑا فیصلہ کروا گیا ہے۔ تم نہ کم عقل ہوؤ نہ بے وقوف اور نہ ہی تم کبھی کوئی نقصان اٹھاؤ گی باوجود اس کے کہ مانو گی تو ہمیشہ اپنے دل کی ہی۔“

وہ اتنے سچے دل سے اس کی تعریف کر رہا تھا کہ وہ مسحوری کھڑی اپنی بہت سی ایسی خوبیوں کے بارے میں جان رہی تھی جو اس سے پہلے کبھی کسی نے اسے بتائی نہیں تھیں۔

”بس اس سے زیادہ تم میری تعریف مت کرنا حمزہ! ورنہ میں ساتویں آسمان پر پہنچنے میں بالکل بھی دیر نہیں لگاؤں گی۔“ وہ شوخ سے لہجے میں بولی اور حمزہ اس بات کو انجوائے کرتا قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ فون بند کر کے وہ واپس اپنے کمرے میں آئی تو سونے کے لیے لیٹنے کے بجائے دانستہ حمزہ کی گفٹ میں دی ہوئی کتاب لے کر بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔



کتنے بہت سے دن گزر گئے تھے نہ سعد نے اس سے کوئی رابطہ کیا تھا نہ خود اس نے اس سے ملنے کی کوئی کوشش کی تھی۔ اس دوران اس کے امتحان بھی ہو گئے تھے۔

اس روز اس کا آخری پیپر تھا۔ وہ پیپر دے کر باہر نکلی تو کوریڈور کے آخری سرے پر سعد کھڑا نظر آیا۔ مناہل اور دیگر دوستوں سے معذرت کرتی وہ اس کے پاس آگئی۔

”کیا تم تھوڑا سا نام مجھے دے سکتی ہو؟“

بغیر سلام دعا کے اس نے خشک انداز میں پوچھا۔ اس بات سے قطع نظر کہ یہ خشک انداز سے کتنا دور کر رہا ہے وہ اس کے ساتھ چل پڑی۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں ایک پرسکون سا گوشہ تلاش کرنے کا میاب ہو گئے تھے۔ اس کے بالکل سامنے بیٹھی وہ اس کا تفصیلی جائزہ لے رہی تھی۔ وہ بہت خاموش اور سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

”کیا خوبی ہے ایسی حزرہ میں جو مجھ میں نہیں۔ اگر حزرہ کے مقابلے پر میرا پوزل بھی موجود ہوتا تو نانا اب مجھے رد کر دیتے؟“ وہ بہت بگڑے تیوروں سے اس سے پوچھ رہا تھا۔

”تم میں کوئی کمی نہیں ہے سعد۔ لیکن۔“

”لیکن تم نے پھر بھی مجھے یہ اطلاع دینا گوارا نہ کیا کہ تمہارے لیے حزرہ کا رشتہ آیا ہے۔ تم ایک بار مجھے میری قسمت آزمانے کا موقع تو دیتیں۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

”تم انتہائی فضول بات کر رہے ہو سعد! میری منگنی ہو چکی ہے۔ کیا اب تمہیں ایسی کوئی بات مجھ سے کہنا زیب دیتا ہے۔“ وہ مصنوعی ناراضی اور خفگی سے گویا ہوئی۔

”بھاڑ میں گئی تمہاری منگنی اور بھاڑ میں گیا تمہارا وہ جیننس حزرہ۔ میں کسی حزرہ کو نہیں جانتا، میں کسی منگنی کو نہیں جانتا۔ کون ہوتا ہے وہ ہمارے درمیان آ کر کھڑا ہو جانے والا۔“ وہ غرایا۔

”وہ وہ شخص ہے جسے میرے لیے میرے نانا ابانے پسند کیا ہے اور ان کی پسند میں نے دل و جان سے قبول کی ہے۔ تمہارے نہ ماننے سے اس رشتے کی اہمیت ختم نہیں ہو جائے گی۔ تم اس طرح کی باتیں کر کے خود کو میری نظروں میں گرا رہے ہو۔“

وہ جواباً اس سے زیادہ غصے میں آ گئی۔ سعد بہت دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ اس کی نگاہوں سے اسے خوف سا محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن وہ پھر بھی خود کو بے خوف اور لا پرواہا ظاہر کرنے کی پوری پوری کوشش کر رہی تھی۔

”میرے ساتھ اس طرح مت کرو فری۔ نانا اب ایسے کوئی ظالم تو نہیں۔ میں امریکہ سے ممی ڈیڈی کو بلواؤں گا۔ وہ انہیں قائل کر لیں گے۔ تم مجھ سے امریکہ نہ جانے کی وجہ پوچھتی تھیں نا۔ میں اسی لیے

نہیں گیا تھا۔ تمہاری وجہ سے۔ میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ پلیز مجھے ایک موقع دو میں ممی کو فوراً بلواؤں گا۔“

وہ اتنا یہ انداز میں اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

”سعد! یقین نہیں آ رہا کہ یہ اتنی بچکانہ اور امپجور باتیں تم کر رہے ہو۔“ تاسف سے اس کی سمت دیکھتی ایک کندھے پر ڈال کر ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔

”جب تک تمہارے دماغ سے یہ خناس نہ نکل جائے بہتر ہے تب تک تم مجھ سے نہ ملو۔“ وہ اس کی طرف دیکھتی بہت ٹھہر ٹھہر کر بولی تھی اور پھر اس کا جواب سننے بغیر ہی آگے بڑھ گئی تھی۔



اس کی ایم اے کی کلاسز شروع ہو گئی تھیں۔ کلاسز شروع ہونے سے پہلے چیشیوں کے دوران اس کی مدد سے ایک مرتبہ بھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ نانی امی نے کئی مرتبہ سعد کے بارے میں پوچھا تھا۔ وہ ہر بار جواب میں بڑے اطمینان سے کہتی۔

”رات ہی تو اس سے میری فون پر بات ہوئی تھی۔ آپ کو سلام کہہ رہا تھا۔ آج کل گھر پر اس وجہ سے نہیں آ پارہا کہ آفس میں کچھ کام کا زیادہ پریشر ہے۔“

وہ باقاعدہ اپنی اور سعد کی فون پر ہونے والی فرضی اور من گھڑت گفتگو انہیں سناتی۔ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ وہ دونوں پچھلے کئی مہینوں سے نہ ایک دوسرے سے ملے ہیں اور نہ آپس میں کوئی گفتگو ہوئی ہے۔ کتنی مرتبہ ان کے سعد کے بارے میں استفسار کے وقت نانا ابا بھی وہیں موجود ہوا کرتے تھے۔ ان تک کو کبھی اس کے لہجے میں جھوٹ کی جھلک نظر نہیں آئی تھی۔ وہ جھوٹ اتنے یقین سے باتیں کر کوئی کسی قسم کا شک کر ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ اس سے ناراض تھا۔ بہت شدید ناراض اور وہ اسے منا نہیں رہی تھی اور نہ ہی اس کا ایسا کوئی ارادہ تھا۔

اس نے ایک بار بھی اس کا موبائل نمبر نہیں ملایا تھا۔ کئی بار دل چاہتا تھا کہ اسے فون کرے اور وہ دونوں آپس میں اسی طرح باتیں کریں جیسے ہمیشہ کیا کرتے تھے۔ مگر اب ایسا ہو نہیں سکتا تھا۔ وہ اس کی آواز سن کر ہی یقیناً فون بند کر دیتا۔ بلکہ شاید اس کا نمبر دیکھ کر فون ہی نہ اٹینڈ کرتا اور اب کی بار وہ اسے منا نہیں سکتی۔ اس سے سوری نہیں بول سکتی۔

حمزہ نے البتہ اس دوران دو تین مرتبہ اسے فون کیا تھا۔ خود اس نے بھی ایک مرتبہ اسے فون کیا تھا۔ وہ اس کے فون کرنے پر بہت خوش ہوا تھا۔ نانی امی اور نانا ابا کی شجاع انکل اور نازیہ آنٹی سے فون پر بات ہوتی تو وہ بھی ان لوگوں سے سلام دعا ضرور کیا کرتی تھی۔



وہ پوری سنجیدگی سے پڑھائی میں مصروف تھی جب چھوٹے نانا نے اچانک شادی کی جلدی مچائی تھی۔

وہ نگار آئی یعنی اپنی اکلوتی بیٹی کے پاس علاج کی غرض سے لندن جا رہے تھے اور وہاں سے اتنی جلدی واپسی کا ان کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ایسے میں ان کی شدید خواہش تھی کہ ان کے سامنے حترہ اور فریا کی شادی ہو جائے۔ ابتدائی طور پر تو نانا نانا نے اس بات کے لیے انکار کیا۔ وہ فریا کے ماسٹرز مکمل کر لینے سے پہلے کسی بھی طرح شادی کے حق میں نہیں تھے۔ مگر پھر ان کے پیہم اصرار اور نانی امی کے سمجھانے پر وہ ان کی بیماری کا سوچتے ہوئے شادی کے لیے رضامند ہو گئے۔

پہلے سمسٹر کے امتحان ہوتے ہی شادی ہو جاتی تھی۔ ابھی سمسٹر ختم ہونے میں دو ماہ باقی تھے۔ لیکن نانی امی نے زور و شور سے تیاریاں شروع کر دی تھیں۔

اس روز وہ نانی امی کے ساتھ بازار آئی ہوئی تھی۔ جب بازار میں سرراہ اس کی سعد سے ملاقات ہوئی۔ اس کے ساتھ اس کا کوئی دوست بھی تھا۔ وہ اکیلی ہوتی تو وہ یقیناً اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ جاتا لیکن نانی امی کو وہ یقیناً نظر انداز کر کے بدتمیزی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے دوست کو انتظار کرنے کا کہہ کر وہ ان لوگوں کے پاس آ گیا۔ وہ خود تو پہلے ہی اسے دیکھ چکی تھی۔ نانی امی نے نہیں دیکھا تھا۔ ہمیشہ کی طرح وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔

”بہت مصروف اور بڑی شخصیت بن گیا ہے میرا بیٹا۔ نانی امی سے ملنے کے لیے آنے کا اب اس کے پاس وقت ہی نہیں ہے۔“

انہوں نے بہت مان بھرے انداز میں شکوہ کیا۔ وہ ان کے شکوہ پر کچھ شرمندہ سا ہوتا اپنی دفتری مصروفیات اور دیگر مسائل کا ذکر کرنے لگا۔ جو ظاہر ہے خود ساختہ تھے۔ اسے بڑا اچھا لگا تھا سعد کا یہ جھوٹ۔ اس کے جھوٹ نے خود اس کے جھوٹ کو بھی مزید سچا بنا دیا تھا۔

”بڑی مشکلوں سے آج اس لڑکی کو زبردستی گھسیٹ کر لائی ہوں۔ شادی کی تیاری کتنا مشکل کام ہے۔ میری بوڑھی ہڈیوں میں اب کہاں اتنا دم ہے کہ بازاروں کے چکر لگا سکوں۔ لیکن یہ اتنے نخرے کرتی ہے۔ لے دے کر تم تھے تو تم اپنی مصروفیتوں میں الجھے ہوئے ہو۔“

وہ اس طرح اس سے بولی تھیں جیسے یہ تو لازمی بات ہے وہ جانتا ہی ہوگا کہ فریا کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی ہے اور آج کل وہ لوگ اس کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ ایک پل کے لیے اس کے چہرے کا رنگ بالکل فق ہو گیا تھا۔ وہ بالکل گم صم سے انداز میں بے یقینی سے انہیں دیکھے جا رہا تھا۔ اس لمحہ اپنے تاثرات چھپانے میں وہ بالکل ناکام رہا تھا۔ لیکن نانی امی اپنی شاہنگز اور بازاروں کے قصے میں اتنی بری طرح الجھی ہوئی تھیں کہ اس کا ٹوٹا بکھرا تا انداز دیکھ ہی نہیں پاتی تھیں۔

”میرا دوست انتظار کر رہا ہے نانی امی۔ میں انشاء اللہ گھر پر آؤں گا۔ پھر تفصیلی بات ہوگی۔“ وہ ان کی بات مکمل ہوتے ہی بول پڑا۔ انہوں نے سر ہلا کر گویا اسے جانے کی اجازت دے دی۔ وہ ندا حافظ کہتا تیزی سے واپس مڑ گیا۔ وہ خاموشی سے بہت سے شاپنگ بیگز ہاتھوں میں پکڑے اسے ہاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

اس کے امتحان بالکل سر پر آ گئے تھے۔ نانا ابا اور نانی امی کو شاپنگز میں الجھتا چھوڑ کر وہ پوری طرح امتحان کی تیاریوں میں مگن تھی۔

اس روز سعد کی سالگرہ تھی۔ اور اتنے برسوں میں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے سعد کو سالگرہ پر خوش نہ کیا ہو۔ کوئی گفت نہ دیا ہو۔ آج بھی اس نے ایسا ہرگز نہیں کیا تھا۔ اتنے دنوں کی لاطلفی کے بعد آج وہ اسے فون کر رہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح رات کے بارہ بجے۔ وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتی تھی۔ اس خوف سے کہ کہیں کوئی دوسرا اسے اس سے پہلے وٹ نہ کر دے وہ رات بارہ بجے ہی اسے فون کیا کرتی تھی۔ ہاں گفت وہ پھر اسے اگلے روز اس کے گھر جا کر دیا کرتی تھی۔

اس نے ڈرتے ڈرتے نمبر ملایا۔ پتا نہیں وہ اس سے بات کرنا پسند کرے گا یا نہیں۔ لیکن اسے زیادہ دیر اس بارے میں کچھ سوچنے اور پریشان ہونے کی ضرورت پیش نہیں آئی کیونکہ دوسری طرف پہلی ہی بیل پرفون اٹھا لیا گیا۔

”پہلی برتھ ڈے سعد۔“ کچھ ڈرتے اور جھپکتے اس نے اسے مبارکباد دی۔

”جھیک یو۔“ اس کا شکر یہ بڑا رسمی سا تھا۔ ”میں اس وقت تمہارے فون کا ہی انتظار کر رہا تھا۔“ بہت سنجیدہ اور کھنچا کھنچا سا لہجہ تھا اس کا۔ وہ اس لہجے پر دل میں افسوس اور اداسی کو جگہ بناتے دیکھ کر بھی بظاہر خوشگوار انداز میں پوچھنے لگی۔

”یقین تو نہیں تھا لیکن پھر بھی میں انتظار کر رہا تھا۔ بہت سی باتوں کا ہمیں یقین نہیں ہوتا لیکن پھر بھی ہم ان کے ہونے کی خواہش تو ضرور رکھتے ہیں۔“ اس کے لہجے میں نہ شوخی تھی اور نہ شرارت نہ کسی قسم کی خوشی اور گرم جوشی۔ بس ایک گہری اور مستقل قسم کی سنجیدگی۔ جو اس کے دل کو بہت دکھ پہنچا رہی تھی۔

”تم کل آؤ گی؟“ ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد اس نے پوچھا۔ وہ اس سے ملنے کے لیے تیار ہے۔ اس کے آنے کے بارے میں دریافت کر رہا ہے۔ وہ اس بات پر بے حد مسرور ہوئی تھی۔

”ہاں میں صبح میں آؤں گی۔ تمہارے آفس جانے سے پہلے۔“ اس نے فوراً ہی بھرتی تھی۔

”ایسا کرو کل یونیورسٹی کی چھٹی کر لو۔“ اس کے لہجے کی سنجیدگی ہنوز برقرار تھی۔

”چھٹی کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ جمعرات کو میرا پہلا پیپر ہے۔ آج کل تو پریپ لیوز ملی ہوئی ہیں۔“ وہ دل ہی دل میں حیران ہوتی جو ابابولی۔

”ارے ہاں۔ میں بھول ہی گیا۔ مئی کا مہینہ چل رہا ہے۔ یونیورسٹی میں امتحانوں کا موسم پورے عرصہ پر ہوگا۔“ اس نے جیسے اپنی یادداشت پر افسوس کیا۔

”چلو ٹھیک ہے پھر کل ملیں گے۔“ اس نے لائن منقطع کر دی تھی۔

ریسیور واپس رکھ کر وہ کافی دیر تک سعد کے اس انداز پر حیران ہوتی رہی۔ کیا اس نے اس رشتہ کو آخر کار قبول کر لیا ہے۔



صبح وہ نانی امی سے سعد کے گھر جانے کا کہتی گھر سے نکل آئی تھی۔ اسے گیٹ پر تیل کرنے کی بھی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ وہ پہلے ہی سے گیٹ پر کھڑا جیسے اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی طرف بغور دیکھتے وہ گیٹ سے اندر آگئی تھی۔ جینز اور ٹی شرٹ پہنے وہ بالکل عام سے حلیہ میں تھا۔ غالباً آج اس کا آفس جانے کا ارادہ ہی نہیں تھا۔ وہ تجھ ہاتھ میں لیے اس سے پہلے ہی لاؤنج کی طرف بڑھنے لگی تھی۔

”آفس سے چھٹی کر کے میں اس لیے تھوڑی بیٹھا ہوں کہ ہم دونوں گھر میں بیٹھیں گے۔ آج میرا مہذب سا لگ رہا ہے۔“

رات کی سنجیدگی کے برخلاف اس وقت وہ بڑے خوشگوار موڈ میں تھا ایسے جیسے ان کے درمیان کوئی جھگڑا اور کوئی لڑائی تھی ہی نہیں۔ اس کے جواب میں کچھ بولنے سے پہلے ہی وہ گاڑی کی طرف بڑھ گیا تھا۔ گاڑی کی چابی ہاتھ میں لیے جیسے وہ اسی کی آمد کا منتظر تھا۔ گاڑی کا دروازہ کھولنے کے بعد وہ اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود گیٹ کھولنے چلا گیا۔

”چوکیدار کہاں ہے؟“ گیٹ پر چوکیدار کی غیر موجودگی کا اسے اب دھیان آیا تھا۔

”چھٹی پر گیا ہوا ہے۔“

گاڑی ریورس کرتے ہوئے سعد نے جواب دیا۔ اپنی پسند کا فاسٹ میوزک لگا چکنے کے بعد وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”ایسا کرو نانی امی کو واپسی میں دیر ہو جانے کا ادر میرے ساتھ باہر جانے کا بتادو۔“

اس نے گاڑی ان کی گلی میں موڑی۔ وہ بھاگتے دوڑتے نانی امی کو اطلاع دے کر واپس گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی۔

”ایسا کرتے ہیں پہلے کہیں سے اچھا سا ناشتہ کرتے ہیں پھر آوارہ گردی شروع کر دیں گے۔“
اس کے چہرے کے حیرت بھرے تاثرات دیکھ کر وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔

”یار! آج میرا تمہارے ساتھ بہت دیر تک آوارہ گردی کرنے کا پروگرام ہے۔ دل چاہ رہا ہے اس مالگرہ کو کچھ مختلف اور یادگار انداز میں مناؤں۔ آج ہم دونوں مل کر کراچی کی خاک چھانیں گے۔“ وہی استانہ اور بے تکلف انداز۔ بغیر بناوٹ اور تصنع کے۔ سادگی اور خلوص لیے ہوئے۔

”تم مجھ سے خفا نہیں ہو سعد! کیا تم نے اس رشتے کو قبول کر لیا؟“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی ہلکا ہٹ کے ساتھ گویا ہوئی۔

”میں تم سے بالکل بھی خفا نہیں ہوں اور میں تم سے کبھی خفا ہو بھی نہیں سکتا۔“ وہ اس کا دوسرا سوال نظر انداز کر کے ٹھوس اور مستحکم انداز میں بولا۔

کچھ دیر بعد ایک چھوٹے سے ہوٹل کے باہر گاڑی روک کر اس نے اپنے اور اس کے لیے حلوہ پوری کا آرڈر کیا تھا۔

گاڑی میں بیٹھ کر حلوہ پوری کھاتے ہوئے سعد کی طرح وہ بھی اس ایڈونچر سے پوری طرح لطف اندوز اور ہی تھی۔ ناشتے سے فارغ ہوتے ہی اس نے اتنی دیر سے اپنی گود میں دھرا گنٹ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

”کتنی دیر سے میں انتظار کر رہا تھا۔ بلکہ ایک بار تو میرے دل میں آئی کہ میں خود ہی اٹھا لوں۔ آخر اس پر اتنا بڑا بڑا اور بلاک لیٹرز میں میرا ہی نام لکھا ہوا ہے تو یقیناً یہ میرے ہی لیے ہے۔“ وہ شکر یہ اور نوازش کے چکر میں الجھے بغیر بے تابی سے گنٹ کھول کر دیکھنے لگا تھا۔

گاڑی ان کے اسکول کی سڑک پر سے گزر رہی تھی۔ وہ اس سڑک کے ایک طرف شان سے جم کر کھڑی ہوئی اس عمارت میں اپنا چھپن ڈھونڈنے لگی تھی۔ سعد نے اسکول کے پاس گاڑی روک دی تھی۔
”تمہیں اسکول کے دن یاد آتے ہیں فری؟“ وہ بغور اس بلڈنگ کی طرف دیکھتا ہوا کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

”ہاں بہت زیادہ۔“ اس نے بڑی سچائی سے اعتراف کیا تھا۔
”تمہارا دل نہیں چاہتا کہ وہ وقت لوٹ آئے۔ میرا تو بہت دل چاہتا ہے کہیں سے بھی کوئی مجھے میرا وہ کھویا ہوا ماضی لا دے۔ وہ وقت کتنا خوبصورت تھا ناں فری۔ ہر فکر اور ہر غم سے آزاد۔ زندگی کا محور اسکول، ہوم ورک، ٹیچرز دوست اور کھیل کود ہوا کرتے تھے اور تمہیں وہ دن یاد ہے جب ایک مرتبہ اسکول کی چھٹی

کے بعد ہم لوگ بجائے گھر واپس جانے کے بل پارک چلے گئے تھے۔ میں تم اور زویہ سبب۔ کتنا مزہ آیا ہاں
 ناں اس روز۔ بارش بھی تو کتنی زوردار ہو رہی تھی۔ بارش میں بھیجے ہم لوگ ڈرائیور کی نصیحتوں کو خاطر میں
 لائے بغیر کتنی دیر تک کھیلتے رہے تھے۔ بارش میں بھیکتے اور شرارتیں کرتے رہے تھے۔“

وہ بڑی شدت سے ان دنوں کو یاد کر رہا تھا اور اس سے ذکر سن کر وہ خود بھی ماضی کی وحشت میں لپٹنے
 دن کو بڑی شدت سے یاد کرنے لگی تھی۔

”پہلے کہیں پر لٹچ کر لیں پھر بل پارک چلیں گے۔“

”ابھی تو ناشتہ کیا ہے۔ میں تو اب شام تک کچھ نہیں کھاؤں گی۔“

”ابھی فوراً نہیں کہہ رہا۔ تھوڑی دیر ٹھہر کر۔ جب بھوک لگے گی تب۔“ وہ دوبارہ تیز رفتاری سے گاڑی
 دوڑانے لگا۔

"Mohatta Palace میں صادقین کی پینٹنگز کی ایگزپیشن لگی ہوئی ہے۔ میرے پاس وہاں
 کے ٹکٹ آئے ہوئے ہیں۔ ایسا کرتے ہیں پہلے وہاں چلتے ہیں۔“

سعد نے رائے لینے والے انداز میں اس کی سمت دیکھا تو اس نے سر ہلا کر اپنی رضامندی دے دی۔
 وہ آرٹ اور آرٹسٹوں کا کوئی بہت بڑا قدر دان نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی وہاں آ کر وہ بہت خوش تھا۔ اس کے
 ساتھ گھومتے وہ صادقین کا کیا بے مثال کام دیکھتے ہوئے وہاں آئے مختلف لوگوں کے بارے میں بھی
 کمنٹس دے رہا تھا۔ وہ اس کے دلچسپ تبصروں پر ہنستی اس کے ساتھ چلتی جا رہی تھی۔ کافی دیر وہاں
 گزار کر وہ لوگ باہر نکل آئے تھے۔

”دون ج رہے ہیں اب تو یقیناً تمہیں تھوڑی بہت بھوک لگنے لگی ہوگی۔ اتنا گھوم پھر کر اور چل کر مجھے تو
 بھوک لگنے لگی ہے۔“ وہ گاڑی اشارت کرتا ہوا اس سے بولا۔

”بھوک تو ابھی بھی نہیں لگ رہی۔ لیکن چلو تمہاری خاطر تھوڑا بہت کھا لوں گی۔“ اس نے جیسے اس پر
 احسان کیا تھا۔

”کیا بات ہے آپ کی۔ پیسے میرے خرچ ہوں اور احسان آپ کا ہو۔“ سعد نے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ
 بھی جو اب مسکرا دی تھی۔

”کہاں چلیں؟“

”جہاں تمہارا دل چاہے۔“

”چاند کے پار چلیں۔“ وہ شرارتی سے انداز میں بولا۔

”چلو۔ میں تیار ہوں۔“ وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

پھر اس نے تو ییزاہٹ میں بیٹھ کر تھوڑا بہت پیزا اور پاشا چکھنے پر اکتفا کیا تھا جبکہ وہ اس طرح کھانے میں مصروف تھا جیسے پتا نہیں کتنے دنوں سے کھانے کو کچھ نہیں ملا تھا۔ ساتھ ساتھ اسے بھی لعنت ملامت کی جا رہی تھی۔

”ارے میری بڑی خون پسینے کی حلال کمائی ہے۔ نوٹ درختوں پر لگے ہوئے نہیں ملتے مجھے۔ چلو یہ سب ختم کرو۔“ وہ اس کی لن ترانیوں سے بے نیاز کولڈ ڈرنک کے سپ لینے میں مصروف تھی۔ وہاں سے باہر نکلے تو گھڑی میں ساڑھے تین بجتے دیکھ کر وہ اس سے بولی۔

”کانی دیر ہوگئی۔ اب واپس چلتے ہیں۔“

”ابھی تو میرا واپس جانے کا موڈ نہیں ہو رہا۔ کہا تو تھا میں نے تم سے کہ آج ہم لوگ کراچی کی سڑکیں چھانیں گے۔ اور ویسے بھی آج میری سالگرہ ہے لہذا بات بھی میری مانی جانی چاہیے۔“ اس نے واپس جانے سے صاف انکار کر دیا۔

”اب ہم بل پارک چلیں گے۔ دعا کرو بارش نہ سہی کم از کم موسم ہی ذرا خوشگوار ہو جائے۔ ہم کراچی والوں کی قسمت میں تو ویسے بھی نہ بارش لکھی گئی ہے نہ سردی۔ مئی میں بارش کی توقع تو خیر رکھی ہی نہیں جاسکتی۔ جبکہ یہاں تو جولائی اگست بھی برسات گزر جاتے ہیں۔“ گاڑی فرسٹ گیسر میں ڈالتے ہوئے بولا۔

”کاش میں نے کچھ اور مانگ لیا ہوتا۔“ بل پارک تک پہنچتے پہنچتے موسم نہ صرف یہ کہ خوشگوار ہو گیا تھا۔ بلکہ بادل بھی برس پڑنے کو تیار نظر آنے لگے تھے۔

”جب ہماری کوئی دعا قبول ہو جاتی ہے تو ہم لوگ یہ کیوں کہتے ہیں کاش قبولیت کی اس گھڑی میں ہم نے کچھ اور مانگ لیا ہوتا۔ جب ہم نے کچھ دیر پہلے وہ چیز مانگی تھی اور وہ اللہ نے ہمیں فوراً دے بھی دی تو ہم بجائے اس کا شکر ادا کرنے کے ناشکر اپن کیوں دکھانے لگتے ہیں۔ آخر ہم حاصل ہو جانے والی شے پر قانع اور مطمئن کیوں نہیں ہوتے۔“ وہ سعد کی بات کے جواب میں مقررانہ انداز میں بولی۔

”سوری ملانی صاحبہ! بڑی بھول ہوئی مجھ سے۔ آئندہ یہ بات کبھی منہ سے نہیں نکالوں گا۔“ اس نے جھٹ اپنی غلط تسلیم کی۔

انہیں وہاں آئے تھوڑی دیر ہی ہوئی ہوگی کہ ہلکی پھلکی پھیواری پڑنی شروع ہوگئی تھی۔ سعد بالکل بچوں کی طرح خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔ اسے ساتھ لیے گھومتا وہ نان اسٹاپ بے ٹکی باتیں کرنے میں مصروف تھا۔

کبھی اپنے کسی کولیگ کا کوئی قصہ اسے سنانے لگتا۔ کبھی کسی دوست کی کوئی بات۔ اس کی قصے کہانیوں پر وہ اتنا نہیں ہنس رہی تھی جتنا وہ خود ہنس رہا تھا۔ اپنی اوٹ پٹانگ باتیں انجوائے کرتا وہ جیسے بالکل بچہ بنا ہوا تھا۔ بہت زندہ دل، بہت بے فکر سا انداز اپنانے جیسے اس کی زندگی میں دور دور تک کہیں کوئی ٹینشن کوئی پریشانی نہیں۔ اسے کوئی غم نہیں۔ وہ الجھ رہی تھی۔ اس سے شاکی ہو رہی تھی۔ وہ نہ خود کچھ بتا رہا ہے نہ اسے پوچھنے دے رہا ہے۔ کیا اتنے مہینوں کی ناراضی اور غصہ یوں اچانک ختم ہو سکتے تھے؟ کیا اس نے اتنی آسانی سے ساری صورت حال کو قبول کر لیا تھا؟

”تم نے یوں منہ کیوں لٹکایا ہوا ہے۔ دیکھو تو موسم کتنا زبردست ہو رہا ہے۔ بارش بھی اچھی تیز ہو گئی ہے۔“ وہ اس کی طرف دیکھتا خشکی سے بولا۔ ”اپنی سالگرہ کے دن تمہارا یہ بسورتا ہوا منہ مجھے بالکل نہیں چاہیے۔“

وہ آسمان کی طرف منہ کر کے چہرے پر پڑنے والے بارش کے پانی کو انجوائے کر رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

”تم شاید تھک گئی ہو۔“ کچھ دیر بعد اس کی خاموشی محسوس کر کے وہ بول پڑا۔ ”آج کل امتحان کی تیاری کی وجہ سے بھی تو تمہاری نیند پوری نہیں ہو پا رہی ہو گی۔“ اس نے خود ہی اس کی خاموشی کی وجہ دریافت کر لی اور واپس جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

وہ اسی خاموشی سے اس کے ساتھ واپس جانے کے لیے مڑ گئی تھی۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے اس نے دوبارہ تیز آواز میں میوزک لگا لیا۔ لیکن اب وہ گاڑی بہت آہستہ چلا رہا تھا۔ ڈرائیو کرنے کے دوران وہ تھوڑی تھوڑی دیر اس کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ ”تم چپ مت بیٹھو فری! کوئی بات کرو۔ کچھ بھی۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔

”کیا بات کروں، میری سمجھ میں ہی نہیں آ رہا۔ تم آج مجھے بہت بدلے ہوئے لگ رہے ہو۔“ وہ اس کے جواب پر تہقہ لگا کر ہنس پڑا۔

”بدلا ہوا اس لیے لگ رہا ہوں کیونکہ تم یہ سمجھ رہی تھیں کہ اتنے مہینوں کی لڑائی اور جھگڑا میں اتنی آسانی سے کبھی ختم نہیں کروں گا۔ اب جب میں نے ایسا کر دیا تو تمہیں حیرت ہو رہی ہے۔“

یار میں وہی سعد ہوں۔ بقول تمہاری دوستوں کے تمہارا انعام رسولؐ تمہارا بہترین دوست۔“ سعد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ گاڑی ان کی گلی میں مڑ چکی تھی۔ سعد نے میوزک بند کر دیا۔ گاڑی میں ایک دم خاموشی پھیل گئی۔ گاڑی اس کے گیٹ کے سامنے روکتے سعد نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”اچھا تو مائی ڈیڑہا رباری خدا حافظ۔“ چہرے پر مسکراہٹ کے باوجود اس کی آنکھوں میں سنجیدگی تھی۔
 ”اندر نہیں آؤ گے؟“ وہ دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔

”پھر سہی۔ فی الحال سوؤ نہیں ہو رہا۔“ وہ بہت گہری نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔
 وہ مزید اصرار کیے بغیر خدا حافظ کہتی گاڑی سے اتر گئی۔ جب تک وہ گیٹ کے اندر چلی نہیں گئی وہ وہیں کھڑا رہا تھا۔ اس کے اندر داخل ہونے پر ہی اس نے گاڑی اشارت کی تھی۔

نانی امی کو اپنے دن بھر کی روداد مختصر الفاظ میں سناتی وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کا ذہن بہت الجھا ہوا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود کچھ پڑھ نہیں پارہی تھی۔ تنگ آ کر کتابیں اور نوٹس ایک طرف ڈالتی وہ سونے کے لیے روزانہ سے جلدی ہی لیٹ گئی۔

سوتے میں بھی کتنی بار اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ پرسکون نیند نہیں سو پائی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب سو کر اٹھی تو سر بھاری بھاری ہو رہا تھا۔ اٹھنے کے بعد جو سب سے پہلا کام اس نے کیا وہ سعد کو فون کرنے کا تھا۔ صبح کے چھ بجے وہ اسے کیوں فون کر رہی ہے وہ نہیں جانتی تھی لیکن اس کی چھٹی حس جیسے کوئی الارم دے رہی تھی۔ وہاں بیل جا رہی تھی لیکن کوئی فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ کتنی دفعہ اس نے نمبر ملایا، کتنی کتنی دیر تک بلیس ہونے دیں لیکن وہاں کوئی فون اٹینڈ ہی نہیں کر رہا تھا۔ موبائل پر ٹرائی کیا تو بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ کتنی دیر کے بعد بہت مایوس ہو کر اس نے اپنی یہ کوشش ترک کر دی تھی۔

نانی امی نے ناشتے کے لیے اسے بلوایا وہ تب ہی بیٹھے آئی تھی۔

”رات بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ اب ناشتہ تو ڈھنگ سے کرو۔“ انہوں نے اسے بے دلی سے چائے کے گھونٹ لیتے دیکھ کر ٹوکا۔

”رات سعد کا فون آیا تھا۔“ نانا ابانانی امی کو بتانے لگے۔ وہ بھی چونک کر ان کی طرف متوجہ ہوئی۔
 ”امریکہ گیا ہے ناں وہ۔ صبح چار بجے کی فلائٹ تھی اس کی۔ خدا حافظ کہنے کے لیے فون کیا تھا۔ کہہ رہا تھا۔ یونہی گھر والوں سے ملنے جا رہا ہوں۔ میں نے کہا فری نے تمہیں اس موقع پر جانے کی اجازت کیسے دے دی تو ہنستے ہوئے کہنے لگا کہ اس کی شادی تک واپس آ جاؤں گا۔ ابھی تو شادی میں خاصے دن ہیں۔“ بے ساختگی میں سلاٹس اس کے ہاتھ سے گرا تھا۔

”وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔“ اس کے دل سے آواز نکلی تھی۔ ”سعد واپس آ جاؤ۔ پلیز واپس آ جاؤ۔ مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔“

پہلی بار ایک ضدی لڑکی اس کے اندر سے بولی تھی۔ نانا ابانانی اچانک چوکتے ہوئے اسے دیکھا۔ اس

سے تو وہ مخاطب بھی نہیں تھے۔ یہ خبر ظاہری بات ہے اس کے علم میں پہلے سے ہی ہوگی۔ سعد کا امریکہ جانا
 آنا کون سی ایسی خیرانی کی بات تھی جو اس کا بطور خاص ودنا تا ایا اور نانی امی سے تذکرہ کرتی۔ وہی لیے اس
 اس بات پر بھی نہیں جو نکلے تھے کہ کل فریانا نے یہ بات ان لوگوں کو کیوں نہیں بتائی تھی۔ ان کی نگاہیں خود پر
 مرکوز دیکھ کر اس نے بڑی شدت سے اللہ کو یاد کیا تھا۔ اپنے لیے استقامت اور منبسطی کی دعا مانگی تھی۔

”میں خود اس سے یہی کہہ رہی تھی کہ یہ کون سا موقع ہے امریکہ جانے کا۔ لیکن اسے آنٹی انکل اور
 زویب بہت یاد آ رہے تھے۔ مجھ سے پکا وعدہ کر کے گیا ہے کہ تمہاری شادی سے پہلے پہلے میں کراچی
 آ جاؤں گا۔“

وہ پلیٹ میں گراسلائس اٹھا کر کھاتے ہوئے ان دونوں کو بتانے لگی۔ اندر بہت اندر زمین دل پر قطرہ
 قطرہ آنسو گر رہے تھے۔

ناشتے کے بعد وہ نانی امی سے پڑھنے کا کہہ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

”تو تم چلے گئے مجھے چھوڑ کر مجھے بتائے بغیر۔“ وہ کھڑکی میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ کھڑکی کھول کر اس نے
 تازہ ہوا کو اندر آنے کا راستہ دیا تھا۔ نیچے لان میں مالی بابا پائپ لگائے کیاریوں میں پانی دیتے ہوئے
 کچھ گنگنا رہے تھے۔ اپنی اسی پرسوز اور خوبصورت آواز میں۔ وہ بہت دھیان سے ان کی گنگنا بہت سننے

لگی تھی۔ یہ دولت بھی لے لو یہ شہرت بھی لے لو

بھلے چھین لو مجھ سے میری جوانی

مگر مجھ کو لونادو بچپن کا ساون

وہ کانڈ کی کشتی وہ بارش کا پانی

”مالی بابا آپ کی آواز میں اتنا سوز اور اتنا درد کہاں سے آیا۔“ یاد کا ایک دریچہ کھلا تھا۔ یہیں اسی لان
 میں وہ دونوں مالی بابا کے سر پر کھڑے ان سے باتیں کر رہے تھے۔

”مالی بابا کو ضرور کسی سے عشق ہوا ہوگا۔ آواز میں اتنا سوز و گداز اور درد عشق میں ناکامی کے بعد ہی
 پیدا ہوتا ہے۔“ سعد نے جیسے اسے اصل وجہ بتائی تھی۔ مالی بابا ان دونوں کے اندازوں پر ہنستے ہوئے

خاموشی سے اپنا کام کرتے رہے تھے۔

کڑی دھوپ میں اپنے گھر سے نکلنا

وہ چیزیاں وہ بلبیل وہ تہلی پکڑنا

وہ گڑیا کی شادی پر لڑنا جھگڑنا

وہ جھولوں سے گبرتا اور گر کے سنبھلنا
 وہ ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کی نشانی
 وہ کاغذ کی کشتی وہ بارش کا پانی
 ”تم یہاں مجھ سے ملنے آتے ہو یا اسٹرا بریز فرفریش کریم کے ساتھ کھانے۔“
 ”دونوں کی وجہ سے تم سے ملنے بھی اور اسٹرا بریز کھانے بھی۔“

کبھی ریت کے اونچے ٹیلوں پہ جانا
 گھروندے بنانا بنا کے مٹانا
 وہ معصوم چاہت کی تصویر اپنی
 وہ خوابوں کھلونوں کی جاگیر اپنی
 نہ دنیا کا غم تھا نہ رشتوں کا بندھن
 بڑی خوبصورت تھی وہ زندگانی
 وہ کاغذ کی کشتی وہ بارش کا پانی

”سعد تم اسکیٹنگ بہت اچھی کرتے ہو۔“

”اور سائیکلنگ اچھی نہیں کرتا؟“

”جو کر لگتے ہو۔ ہاتھ چھوڑ کر سائیکلنگ کرتے ہوئے۔ ایسے کرتے تو جو کر دکھاتے ہیں۔“

مگر مجھ کو لوٹا دو بچپن کا ساون

وہ کاغذ کی کشتی وہ بارش کا پانی

وہ کھڑکی کا پٹ تھا ہے بالکل ساکت کھڑی تھی۔ ”مگر مجھ کو لوٹا دو بچپن کا ساون۔“ اس کے کانوں میں

سلسل ایک ہی مصرع گونج رہا تھا۔



”ڈیز فرفری!“

میں تمہیں بتائے بغیر امریکہ آ گیا۔ اس بد تمیزی پر مجھے معاف کر دینا۔ میرے یہاں آنے کی سب
 یاری کھیل تھی۔ بس صرف اپنی سالگرہ کے دن کا انتظار کر رہا تھا۔ بتائے بغیر میں اس لیے آ گیا کہ میں
 اپنی آنکھوں میں تمہارا ہنستا اور کھلکھلاتا ہوا روپ سجا کر یہاں آنا چاہتا تھا۔ تاکہ جب جب کبھی میں تمہیں
 پا کروں تو تم ہنستی مسکراتی میرے تصور میں آؤ۔ اگر میں تمہیں اپنے جانے کا بتا دیتا تو ایسا کبھی بھی نہیں
 ہو سکتا تھا۔

فری! تم اس روز ایک سوال بار بار مجھ سے پوچھ رہی تھیں یہ کہ ”میں تم سے ناراض تو نہیں؟“

یقین کرو میں تم سے بالکل بھی ناراض نہیں ہوں۔ تمہارا فیصلہ میں نے قبول کر لیا، اسے مان لیا۔ واقعی بہت اچھا انسان ہے۔ نانا بابا کو وہ اگر پسند ہے تو اس میں کچھ غلط نہیں۔ میں نے اس کی آنکھوں میں تمہارے لیے بڑی انوکھی سی چمک اور محبت دیکھی ہے۔ مجھے یقین ہے وہ تمہیں بہت خوش رکھے گا۔

تمہاری زندگی کے سب سے اہم موڑ پر میں تمہارے پاس نہیں ہوں گا۔ میں ایسا کرنا نہیں چاہتا لیکن ابھی خود میں اتنا حوصلہ نہیں پاتا۔ تم مجھے میری اس کم ہمتی کے لیے معاف کر دو۔ لیکن اس بات یقین رکھنا فری کہ چاہے میں تمہارے پاس ہوں یا نہیں میری دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں گی۔ منیر جب بھی اللہ سے اپنے لیے کچھ مانگے بیٹھے گا تو اس کی ان دعاؤں میں فری یا عبد الرحمن کا حصہ ضرور ہوا کرے گا۔

تم میرے لیے بالکل بھی اداس مت ہونا فری۔ میں پاکستان ضرور آؤں گا۔ کب؟ یہ مجھے بھی پتا۔ لیکن میں لوٹوں گا ضرور اور جب کبھی پاکستان آیا تم سے اور حمزہ سے ملنے بھی ضرور آؤں گا۔ تمہارا دوست سعد منیر“

قلم ایک طرف رکھ کر اس نے اپنے لکھے ہوئے لفظوں پر ایک نگاہ ڈالی تھی اور پھر مطمئن ہو کر کاغذ کر کے لفافے میں ڈالنے لگا تھا۔ لفافہ بند کر کے اور اس پرائیڈر لیس لکھ کر اس نے اسے اپنی رائٹنگ میز کی دراز میں ڈال دیا۔ کل صبح اسے یہ خط پاکستان پوسٹ کر دینا تھا۔

رات کے تین بج رہے تھے۔ مئی ڈیڑی اور زوہیب سب اپنے اپنے کمروں میں بے خبر سو رہے تھے اور خود اس کی آنکھوں سے نیند کو سوں دور تھی۔

”تم میرے یہاں آ جانے پر بہت اداس ہوگی فری! مجھے پتا ہے تم بہت روئی بھی ہوگی۔ مگر میں کروں اب وہاں ٹھہرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ جو بات میں نے کبھی خوابوں میں بھی نہیں سوچی تھی وہ حقیقت میں ہونے جا رہی ہے۔ میرے تمام بھیا تک خواب سچ ہو گئے۔ حالانکہ میں نے تو اپنے برس اور ڈراؤ نے خواب کسی کو سنائے بھی نہیں تھے۔ میرے تمام بدترین خدشات درست ثابت ہو گئے۔

میرا وجدان جو مسلسل ایک خدشہ میرے سامنے رکھ رہا تھا۔ وہ حقیقت بن گیا۔ پہلی بار حمزہ کو دیکھ کر مجھے کیا ہوا تھا؟ وہ مجھے بہت برا لگا تھا۔ اس لیے کہ اس کی آنکھوں میں تمہارے لیے بڑا نرم اور محبت کا تاثر تھا۔ بالکل ویسا ہی جیسا میری آنکھوں میں تمہارے لیے ہوتا تھا۔ مجھے ایسا لگا تھا کہ وہ میرے لیے تمہارے بچ آ رکھڑا ہو گیا ہے۔ وہ تمہیں مجھ سے دور کر رہا ہے۔ میرا دل چاہا میں اس شخص کو کہیں غائب

کردوں۔ وہ تمہیں دیکھ نہ سکے۔ اسے تمہاری وہ خوبیاں نظر نہ آئیں جو مجھے نظر آتی ہیں۔ جن کی وجہ سے تم اتنی اچھی اور سب سے مختلف لگتی ہو۔ لیکن آج جب میں ایک ہارے ہوئے کھلاڑی کی طرح شکست خوردہ اور تنہا یہاں کھڑا ہوں تو مجھے اس بات پر یقین کرنا پڑ رہا ہے کہ زندگی میں ہمیشہ سب کچھ ہماری مرضی کے مطابق نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہم چاہ رہے ہیں۔ اللہ بھی وہی چاہے۔ ایسا ہونا ضروری تو نہیں۔

میں اللہ کی رضا میں راضی رہنا ہے۔ اس کے فیصلوں کو قبول کرنا ہے۔ بغیر ضد کیے لیکن پھر بھی مجھے تم سے ایک شکوہ ہے فری۔ اور یہ شکوہ ہمیشہ رہے گا۔ تمہارے پاس مجھے دینے کے لیے کیا ایک اعتراف محبت بھی نہیں تھا۔ میں تم سے تمہارا ساتھ نہیں مانگتا، یہ نہیں کہتا کہ تم میرے بجائے کسی اور کو کیوں جن رہی ہو۔ لیکن کیا اقرار محبت بھی تم مجھے نہ دے سکتی تھیں۔ کیا میں اتنا سا بھی حق نہیں رکھتا تھا۔ تمہارا وہ ایک اقرار پھر ساری زندگی مجھے مطمئن اور خوش رکھ سکتا تھا۔ مگر تم نے اقرار کا وہ ایک لمحہ بھی مجھے نہیں دیا۔ تمہارے دل میں میری محبت تھی لیکن تمہاری زبان پر اس کا اقرار نہیں تھا۔

تم نے نانا ابا اور نانی امی کی خاطر ان کی محبت میں حمزہ کا ساتھ قبول کر لیا۔ ٹھیک ہے۔ میں اسے غلط نہیں کہتا۔ تم جیسی اچھی لڑکی کو ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ لیکن تم صرف ایک بار مجھے اپنی محبت کا یقین تو دلا سکتی تھیں۔ پھر ہجر کا یہ سفر کتنا آسان ہو جاتا۔ اور شکوہ تو تمہیں بھی مجھ سے ہو گا فری! محبت کے رشتے کو درمیان میں لا کر میں نے دوستی کے رشتے کو ختم کر ڈالا۔ اگر مجھے تم سے دوستی کا دعویٰ تھا تو پھر تمہاری زندگی کے اس سب سے اہم موقع پر مجھے تمہارے سب سے قریب ہونا چاہیے تھا۔ تمہارا یہ شکوہ بالکل بجا ہے۔ میں تم سے اپنا کوئی رشتہ نہ نبھاسکا۔ مجھے نہ دوستی کرنی آئی نہ محبت۔

اور اس روز میں تمہیں بہت بدلا ہوا اور ابا نارل لگ رہا تھا۔ تمہیں بتاؤں فری! اس ایک دن میں میں نے اپنی پوری زندگی جی لی۔ اب مجھے زندگی سے کوئی شکایت نہیں۔ اب زندگی میں جتنے بھی غم آئیں گے جتنی بھی آزمائشیں آئیں گی۔ میں سہہ لوں گا۔ تمہارے ساتھ گزارا وہ دن میری سب سے قیمتی یاد ہے۔ اس روز میں نے تمہیں جی بھر کر دیکھا تھا۔ ان نظروں سے کہ پھر دوبارہ کبھی ہم ملیں تو شاید میرے پاس وہ حق نہیں ہوگا کہ تمہیں اتنے پیارا اور اتنے استحقاق سے دیکھ سکوں۔ میں کوئی جوگی یا سادھو بننے نہیں جا رہا۔ میں ایک بہت ہی بھرپور اور نارمل زندگی گزاروں گا۔ کچھ عرصہ گزرے گا میں اپنی زندگی میں ایک ساتھی کی کمی محسوس کروں گا تو کسی نہ کسی کو شریک سفر بھی کر لوں گا۔ لیکن اس سب کے باوجود میرے دل کا ایک کونا ہمیشہ تمہارے دم سے آباد رہے گا۔ کوئی بھی اور کبھی بھی تمہیں وہاں سے نکال نہیں سکے گا۔

وہ آسمان پر چمکتے تاروں پر ننگا ہیں جمائے خاموش کھڑا تھا۔



وہ خط اس نے اپنی مایوں کے دن وصول کیا۔ نانی امی نے شادی سے کئی دن پہلے ہی اسے مایوں بٹھا دیا تھا۔ جس روز وہ آخری پیپر دے کر آئی اسی شام اس کی مایوں کا فنکشن تھا۔ حالانکہ ابھی شادی میں کال دن تھے۔ گھر میں مہمانوں کا ہجوم تھا۔ وہ اپنے کمرے میں جلدی جلدی خط پڑھ رہی تھی جب نانی امی کمرے میں آئی تھیں۔ اس نے جلدی سے خط اپنے سے ایک قدم پیچھے بک شیلف میں سے ایک کتاب نکال کر اس میں رکھ دیا تھا اور کتاب بھی فوراً ہی واپس بک شیلف میں رکھ دی تھی۔ نانی امی کے پیچھے پیچھے اس کی بہت سی کزنز بھی کمرے میں آ گئی تھیں۔

پہلے کرتے پا جاے میں بغیر کسی میک اپ کے ہی وہ سب کو بہت حسین لگ رہی تھی کچھ ہی دیر میں اس کے کمرے میں مزید کئی لوگ جمع ہو چکے تھے۔ اس محفل کی مہمان خصوصی وہ تھی اس لیے آنے والا ہر مہمان اس کے پاس آنا اور اس سے ملنا چاہتا تھا۔ اس کی دوستیں گلا پھاڑ پھاڑ کر گانے اور ڈھولک بجاتے ہیں مصروف تھیں۔ رات گئے بھی اسے تنہائی نصیب نہیں ہوئی تھی۔

کراچی میں رہنے والے رشتہ دار تو رات میں واپس چلے گئے مگر جو دوسرے شہروں سے آئے ان سب کا یہیں قیام تھا۔ یہ اس گھر کی پہلی شادی تو نہیں تھی لیکن یہ اس گھر کی پہلی خوشی ضرور تھی وہ خوشی جو خوشی کی طرح منائی جا رہی تھی۔ نانی امی کو ان دنوں ہر پرانی اور بھولی بھری روایت یاد آ رہی تھی۔ وہ پوری طرح ان کے رحم و کرم پر تھی۔

شادی سے دو روز پہلے اسے سعد کی جانب سے اپنی شادی کا تحفہ موصول ہوا تھا۔ اسی روز آئی نے بھی امریکہ سے فون کیا تھا۔ انہوں نے نانی امی سے اور فریاسے بات کی تھی۔ اسے پتا تھا ان سے یہ فون سعد نے ہی کر دیا تھا۔ وہ نانی امی اور فریاسے سعد کی طرف سے شادی میں شرکت نہ کر سکنے پر معذرت کر رہی تھیں۔ اس کی بیماری کی جھوٹی اطلاع دے رہی تھیں۔ یہ بتا رہی تھیں کہ وہ بیماری کی وجہ سے نہیں آسکے گا ورنہ اس کی تو جہاز کی سیٹ تک کنفرم تھی۔

ایسا کر کے وہ یقیناً اسے بہت سی الجھنوں اور پریشانوں سے بچانا چاہتا تھا۔ بہت سے لوگوں کی نگاہوں میں اس کا نہ آنا کٹنگ سکتا تھا۔ سب سے بڑھ کر حمزہ کی نظروں میں جو یہ بات جانتا تھا کہ فریاسے سعد سے کتنی گہری دوستی ہے اور ایک بہت قریبی دوست اپنے دوست کی خوشی میں شریک نہ ہو تو لوگ بہت سی باتیں سوچ سکتے ہیں۔



”دیکھیں ماما! آپ کی ریڈرائیڈنگ بڈ راستہ نہیں بھولی۔ وہ اسی راستے پر چلی ہے جس پر آپ نے اس

ہے چلنے کو کہا تھا۔“

آئینے میں نظر آتے اپنے اس سجے سنورے روپ کو دیکھتے ہوئے اس نے بے آواز ماما کو پکارا تھا۔
رخ عروسی جوڑے میں ہمیش قیمت زیورات سے سجا اس کا یہ روپ دیکھنے والوں کو مبہوت کر رہا تھا۔ اب
گج جس جس کی اس پر نگاہ پڑی تھی دیکھنے والا اسے دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ اتنی خوبصورت کہ اس پر سے
ٹاپیں ہٹانے کو جی نہ چاہے۔ وہ بیوٹی پارلر سے تیار ہو کر آ چکی تھی جبکہ باقی سب لوگ ابھی تیار ہو رہے
تھے۔ گھر میں عجیب بھاگ دوڑ اور گہما گہمی سی پھیلی ہوئی تھی۔ پورے گھر میں اس وقت سوائے نانا ابا اور
انی امی کے بیڈروم کے کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں سکون اور خاموشی ہو۔ نانی امی نے اسے کچھ دیر آرام اور
سکون سے بیٹھنے اور سستا لینے کے لیے وہیں بھیج دیا تھا۔ نانا ابا کے رعب اور دب بے کی وجہ سے وہاں کسی
کی آمد کا کوئی امکان نہیں تھا وہ صوفے کی پشت سے سر ٹکائے ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے میں خود کو دیکھے
ہا رہی تھی۔ نانا ابا نہا کر باہر نکلے تو اسے دیکھ کر ٹھنک کر رک گئے تھے۔ کتنی حسین لگ رہی تھی وہ۔ بالکل
ڈاک سی۔ کالج کی گڑیا جیسی۔ انہیں خود اپنی ہی نظر لگ جانے کا اندیشہ ہوا تو جلدی سے اس پر سے
ظہریں ہٹالی تھیں۔

اس کے پاس آ کر انہوں نے ”ماشاء اللہ“ کہہ کر اس کی پیشانی چومی۔ وہ اس کے برابر میں ہی بیٹھ
گئے۔ اس کا سراپے شانے پر نکاتے انہوں نے پیار سے پوچھا۔

”خوش ہے نامیری بیٹی؟“

”جی نانا ابا۔“ اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

”نانا ابا! اگر آج میں آپ سے کچھ مانگوں تو کیا آپ وہ مجھے دیں گے۔“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد
اس نے اسی دھیمی آواز میں پوچھا۔

انہوں نے اس کا سراپے شانے پر سے ہٹایا اور اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کر بولے۔
”تمہیں مجھ سے کچھ مانگنے کے لیے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس جو کچھ ہے وہ سب تمہارا ہے۔“

”سوچ لیں۔ آپ کو نہیں پتا میں آپ سے کیا مانگنے والی ہوں۔“ اس نے جیسے انہیں ڈرانا چاہا۔ وہ
اس انداز پر ہنس پڑے۔

”سوچ لیا۔“ ان کے چہرے پر شوخی اور ہنسی تھی۔

”آپ ماما کو معاف کر دیں نانا ابا! آپ میری ماما کو معاف کر دیں۔“ وہ التجائی انداز میں ان کے ہاتھ
پر اپنے ہاتھ رکھ کر بولی۔

”فری!“ وہ سکتے کے سے عالم میں اسے دیکھتے رہ گئے۔ وہ ان سے کیسی بات کر رہی تھی۔ خاموش اور گم صدمہ دیکھ کر وہ ان کے ہاتھ اپنے چہرے پر سے ہٹا کر صوفیے پر سے اٹھی اور ان کے سامنے دو زانو ہو کر کارپیٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اسے نیچے بیٹھنے پر ٹوک نہیں پائے تھے۔

”آپ نے ابھی ابھی مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں جو مانگوں گی وہ آپ دیں گے۔ اب آپ وعدے سے مکر نہیں سکتے۔ میں آپ سے اپنی ماما کے لیے معافی مانگ رہی ہوں۔ اگر آپ نے اذ معاف نہ کیا تو میں سکون سے اپنی نئی زندگی کا آغاز نہیں کر سکوں گی۔ پھر ہمیشہ کی طرح ماما میرے خواب میں آیا کریں گی یہ کہتی ہوئی کہ ”فری! پاپا مجھے معاف نہیں کرتے۔ ان سے کہو مجھے معاف کر دیں۔“ یہ خواب پھر مجھے سکون سے جینے نہیں دیں گے۔ آپ میرا یہ اضطراب ختم کر دیں۔ ماما کی روح جو قرار ہے اسے آپ کی معافی ہی سے قرار مل سکتا ہے۔“

وہ ان کے گھٹنوں پر ہاتھ جمائے روتے ہوئے بولی۔

”فری! اس طرح سے مت روؤ۔ میرے دل کو تکلیف ہو رہی ہے۔“

”وہ آپ سے معافی مانگنا چاہتی تھیں نانا بابا۔ ان کی زندگی نے وفانہ کی۔ وقت نے انہیں مہلت دی۔ ورنہ وہ آپ کے پاس معافی مانگنے ضرور آتیں۔“ وہ اسی طرح روتے ہوئے بولی۔

”میں اس سے ناراض نہیں فری! وہ میری بیٹی تھی۔ کیا کوئی باپ اپنی بیٹی سے ناراض ہو سکتا ہے۔ وہ مجھے چھوڑ گئی تھی۔ میں نے اسے نہیں چھوڑا تھا۔ پھر مجھ سے ناراض ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس دنیا ہی چلی گئی۔ مجھ سے ملے بنا۔ مجھ سے کوئی بات کیے بنا۔“

اس نے زندگی میں پہلی بار اس باپ کی آنکھوں میں اپنی مرجانے والی بیٹی کے لیے آنسو دیکھے تھے ان کی آنکھوں سے ایک تسلسل سے بہتے آنسو اس کے ہاتھوں پر گر رہے تھے۔ ایک دوسرے کے آٹھ سامنے وہ دونوں رو رہے تھے۔ کوئی کسی کو چپ کرانے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔

”اور آپ میرے پاپا کو بھی معاف کر دیں۔ وہ آپ کو جتنے بھی برے لگتے ہوں

”تمہارا باپ بہت اچھا انسان تھا فری! اس سے تو مجھے کبھی شکایت تھی ہی نہیں۔ اس نے میری بیٹی کو جس محبت سے اپنی زندگی میں شامل کیا تھا پھر اسی محبت سے اس کا مرتے دم تک ساتھ نبھایا۔“

اپنے آنسوؤں پر قابو پاتے ہوئے انہوں نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔ اسی وقت کمرے کا دروازہ کھول کر نانی امی اندر آئیں اور ان دونوں کو یوں روتا دیکھ کر وہ جو خود کو بہت مشکلوں سے سنبھالے بیٹھ تھیں۔ ایک دم خود پر سے اختیار کھوتی بلک بلک کر رونے لگی تھیں۔

یہ نواسی جس میں ان کی جان تھی، جس کے ناز اٹھاتے اور خیال رکھتے وہ بیٹی کا غم برداشت کر گئی
 آج جب اس کی جدائی کا لمحہ آیا تو انہیں اپنے جسم سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ انہیں یوں
 پراری سے رو تادیکھ کر وہ دونوں اپنا رونا بھول گئے۔

”نزہ شجاع احمد ولد شجاع احمد بعوض....“

کوئی اس کے پاس بیٹھا کہہ رہا تھا۔ اس وقت تو اس کی توجہ کا مرکز اس کے ماما اور پاپا تھے۔ جنہیں وہ
 آنکھوں سے اپنے سامنے کھڑا مسکراتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ پاپا تو ہمیشہ ہی اس کے خیالوں اور
 خیالوں میں مسکراتے ہی آئے تھے مگر آج تو ماما بھی مسکرا رہی تھیں۔ کتنے خوش لگ رہے تھے وہ دونوں۔
 انہیں دیکھ کر مسکرائی تھی۔

”ماما! آپ نے ایک محبت کے پیچھے بہت سی محبتیں اور رشتے گنوائے تھے۔ آپ نے محبت اور رشتوں
 سے محبت جینی تھی۔ میں رشتے چن رہی ہوں۔ اس یقین کے ساتھ کہ اپنے اس فیصلے پر کبھی پچھتاؤں
 گی نہیں۔“

ماما اس کی بات سن کر پر شفقت انداز سے مسکرائی تھیں۔ اس نے ایک دم آنکھیں کھول دیں۔ ہولے
 اپنے سر کو قرار میں جنبش دیتے اب وہ نکاح نامے پر دستخط کر رہی تھی۔

”اپنا دل نکال کر دے رہے ہیں تمہیں حمزہ! اس کا بہت خیال رکھنا۔“

رہنمائی کے وقت پھوٹ پھوٹ کر روتی نانی امی نے حمزہ سے کہا تھا۔ حمزہ نے یقین دلانے والے انداز
 میں ان کے ہاتھ تھامے تھے۔ شجاع انکل اور نازیہ آنٹی انہیں ہر طرح اس کا خیال رکھنے اور اسے اتنی ہی
 محبت دینے کی یقین دہانی کروا رہے تھے جتنی انہوں نے اسے دی تھی۔ رخصت کرتے وقت نانا ابانے
 ای شدت سے گلے لگا کر اسے پیار کیا تھا۔ ہمیشہ خوش رہنے کی دعائیں دی تھیں۔



گھر ابھی بھی مہمانوں سے بھرا ہوا تھا لیکن اب ہر سو خاموشی اور ویرانی سی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک اس
 کے چلے جانے سے جیسے سارا گھر ہی ویران ہو گیا تھا۔ وہ دونوں اس کے چلے جانے پر دل میں ادا سی گھر
 کرتی محسوس کر رہے تھے۔ لیکن اس تھوڑی سی اداسی کے پیچھے ڈھیر ساری خوشی بھی تھی۔

اسے ایک بہت اچھا گھر مل گیا، قدر کرنے والے لوگ مل گئے اور سب سے بڑھ کر ایک چاہنے والا
 ٹوہل گیا۔ اس سے زیادہ وہ اس کے لیے کیا چاہ سکتے تھے۔ اب تو بس صرف دعائیں تھیں جو انہیں اس
 کی ان خوشیوں کے سدا قائم رہنے کے لیے ہمیشہ کرنی تھیں۔

ثانی امی گھر واپس آتے ہی اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ آہستہ آہستہ تمام افراد سو گئے۔ پورے گھر میں ہوکا عالم تھا۔ وہ پتا نہیں کتنی دیر سے لاؤنج میں اکیلے بیٹھے ہوئے تھے۔ کتنی دیر بعد وہ وہاں سے اٹھ کر اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئے تو بجائے اپنے کمرے میں جانے کے ان کے قدم خود بخود اس کمرے کی طرف اٹھنے لگے جس میں برسوں ہوئے انہوں نے جانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ دل مضبوط کر کے انہوں نے اس کمرے پر نگاہ ڈالی۔ وہاں کی ہر چیز دیکھی ہی تھی بالکل وہیں تھی جہاں برسوں پہلے وہ دیکھا کرتے تھے۔ ہاتھ لگا لگا کر ایک چیز کو چھو کر دیکھ رہے تھے۔ اچانک ان کی نگاہ دیوار پر لگی اس تصویر پر پڑی۔ اس گھر کی کسی دیوار پر اس کی واحد تصویر جو اب بھی اپنی جگہ پر موجود تھی۔

”پاپا!“ وہ تصویر سے نکل کر ان کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

”جان پاپا!“ اس کی طرف بڑھتے ہوئے انہوں نے اپنی باتیں پھیلائی تھیں اسے خود سے لینا۔ اس کے لیے بہت ساری باتیں کرنے کے لیے۔ وہ اپنی پذیرائی کا یہ انداز دیکھ کر دیوانہ وار ان کی طرف بھاگتی ہوئی آئی تھی۔ اسے اپنے سینے سے لگائے وہ بلک بلک کر رو رہے تھے۔

”کیا کوئی اپنے پیاروں کے ساتھ اس طرح بھی کرتا ہے۔ کیا یوں انہیں چھوڑ دیا جاتا ہے۔“ انہوں نے اس سے شکوہ کیا تھا۔

”میں نے کب چھوڑا تھا۔ آپ نے میری واپسی کا ہر دروازہ بند کر دیا تھا۔“ وہ ان کے شکوے کے جواب میں روٹھے لہجے میں بولی۔

”میں نے کہا اور تم نے میری بات مان لی۔ اپنے پاپا سے ضد باندھ لی کہ ہاں اب جیتے جی کبھی آپ کا اپنی شکل نہیں دکھاؤں گی۔ ذرا سا بھی پاپا کے دل کا خیال نہ کیا۔ یونہی خاموشی سے موت کو گلے لگایا۔“ وہ آنسو بہاتے شکایت بھرے انداز میں بولے۔ وہ اسی طرح سے گلے سے لگائے روئے جا رہے تھے۔

”مجھے ڈر لگتا تھا آتے ہوئے۔ میری ہمت نہیں ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا آپ میری شکل دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیں گے۔ کہیں گے ہم تمہیں نہیں جانتے۔ ہماری بیٹی تو مر چکی۔“

”تم آتیں تو سہی۔ میں کتنا بھی ناراض تھا مجھے کتنا ہی غصہ تھا۔ مگر میرے سینے میں ایک باپ کا دل بھی تو تھا۔ جو بیٹی کی بڑی سے بڑی خطا معاف کر دینے کو تیار تھا۔ کیا تمہیں معاف کر دینے کے لیے میں خواہ تمہارے پاس آتا۔“ وہ اس کی بات کے جواب میں روتے ہوئے غصے سے چیخے۔ پھر کتنی دیر تک وہ روتے رہے تھے۔ کمرے میں ان کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ زندگی میں پہلی بار وہ بیٹی کی موت پر رو رہے تھے۔ دل کو یہ یقین دل رہا ہے تھے کہ ان کی لاڈلی بیٹی اپنے پاپا کو کبھی بھولی نہیں تھی۔

اچانک ان کے تصور میں فریا کا سراپا لہرایا۔ اسی نے تو یہ پھانس ان کے دل سے نکالی تھی۔ اسی نے تو ان انہیں یہ یقین دلایا تھا کہ وقت نے ان کی ضوفشاں کو مہلت نہیں دی ورنہ وہ ضرور آتی اپنے پاپا کو نانے۔ ان کی ساری ناراضیاں دور کرنے۔

دلہن بنی روتی بلکتی اپنی ماں کے لیے معافی مانگتی، ان سے التجائیں کرتی کہ میری ماما کو معاف کر دیں۔ ان کی کبھی اندازہ ہی نہیں ہوا تھا کہ وہ اس قدر حساس ہے۔ وہ تو اسی کو بڑی محبت اور بڑے پیار سے یاد کر رہے تھے۔ وہ اب کمرے میں موجود چیزوں کو صرف ضوفشاں ہی کے حوالے سے نہیں دیکھ رہے تھے بلکہ فریا کے حوالے سے بھی۔ یہ سب چیزیں پچھلے کئی برسوں سے اس کے استعمال میں بھی تو رہی تھیں۔ اب شیلف میں سچی کتابوں کو محبت سے اٹھا اٹھا کر دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے بہت سی کتابیں فریا کی بھی تھیں۔

اچانک ایک کتاب واپس رکھتے اس میں سے ایک کاغذ گرا۔ انہوں نے جھک کر کاغذ اٹھایا اور اسے واپس کتاب میں رکھنے لگے۔ واپس رکھتے کاغذ پر لکھے ایک جملے پر اتفاقاً ان کی نگاہ پڑی تھی۔

”تمہاری زندگی کے سب سے اہم موڑ پر میں تمہارے پاس نہیں ہوں گا۔ میں ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن ابھی خود میں اتنا حوصلہ نہیں پاتا۔“

یونہی بے خیالی میں پڑی وہ نگاہ ٹھٹھک کر اس کاغذ پر جم گئی۔ انہوں نے وہ مڑا ہوا کاغذ پورا پورا کھول کر اپنے سامنے کر لیا۔ جیسے جیسے وہ پڑھتے جا رہے تھے ویسے ویسے ان کے چہرے کے تاثرات بدلتے جا رہے تھے۔ اختتام تک آتے آتے وہ دل تھام کر نڈھال سے ہوتے کارپیٹ پر بیٹھتے چلے گئے۔

”یہ تم نے کیا کیا فری! کیوں کیا تم نے ایسا۔ میری خاطر ایک ایسی قربانی دے ڈالی جو میں نے تم سے کبھی مانگی ہی نہیں تھی۔“

پہلی مرتبہ انہیں پتا چلا کہ وہ فریا عبدالرحمان کو بالکل نہیں جانتے۔ انہی کبھی پتا ہی نہیں چلا کہ وہ لڑکی باپ اور بیٹی کی اس کہانی کا مرکزی کردار بن گئی۔ وہ کہانی کو اپنے من چاہے انداز میں اختتام تک پہنچا رہی ہے۔ پانچوں کی طرح وہ اس کے کمرے کی ایک ایک چیز کو ٹٹولنے لگے۔ یوں جیسے اس تمام سامان میں سے وہ کہیں نہ کہیں سے فریا کو ڈھونڈ نکالیں گے۔ اس فریا کو جسے وہ بالکل بھی نہیں جانتے۔ انہوں نے میز کی دراز میں رکھی ہوئی ڈائری نکالی۔

یہ رائٹنگ ضوفشاں کی نہیں تھی۔ یہ کس کی رائٹنگ تھی وہ اس بات سے بخوبی آگاہ تھے۔ وہ ڈائری ہاتھ میں لیے گرنے والے انداز میں نیچے بیٹھ گئے۔

”آج بے اختیار میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی ہے کہ کسٹس میں ایک عام سی لڑکی ہوتی۔ جو ایک نارمل زندگی گزار رہی ہوتی۔ زندگی میں کہیں کوئی ناہمواری اور الجھاؤ نہ ہوتا۔ میرا کوئی ماضی نہ ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا سعد تو پھر میں تمہیں کبھی مایوس نہیں کرتی۔ کبھی تمہارا دل نہ توڑتی۔ تم سے محبت جو کسی شخص کو کوششوں کا نتیجہ نہیں۔ جو پتا نہیں کب کس لمحہ میرے دل میں پیدا ہوئی اور پھر میرے ساتھ چلی بیٹھی جو ان ہوئی۔ میں کبھی اس محبت سے منہ نہ موڑتی۔ لیکن بات یہ ہے کہ فریاد عبد الرحمان ایک عام لڑکی نہیں۔ اس کی زندگی ایک وعدے سے جڑی ہے۔ وہ وعدہ جو یہاں ہوتے وقت اس کی ماں نے اس سے لیا تھا۔

”میں اپنے ماں باپ کا دل توڑ آئی تھی۔ ان سے ان کی اکلوتا بیٹی ان کی زندگی کی واحد خوشی میں نے چھین لی تھی۔ تمہیں میری غلطیوں کا کفارہ ادا کرنا ہے۔ میرے سب ترس ادا کرنے ہیں۔“

اولاد ہی والدین کی غلطیوں کا کفارہ ادا کرتی ہے۔ جب کما کے ماں باپ مر جاتے ہیں تو وہ شخص جنازے کے پاس کھڑا ہو کر کہتا ہے کہ

”میرے والدین کے ذمے کسی کا قرض تھا تو وہ آئے اور مجھ سے اپنا قرض وصول کر لے۔“

جب تک تمام قرض ادا نہ ہو جائیں اس شخص کی اللہ کے ہاں بھگت بخشش نہیں ہوتی اور مجھے ماما کا وہ قرض چکانا ہے۔ ماما کی طرف سے نانا ابا سے معافی مانگنی ہے۔ انہیں ان کا کھویا ہوا مان لوٹانا ہے۔ وہ مان جو ماما نے توڑا تھا اسے میں نے انہیں واپس کرنا ہے۔ ماما کی روح کو ٹھون پہنچانا ہے۔ انہیں ان کی کھوئی ہوئی جنت لوٹانی ہے۔ ہاں ہمارے ماں باپ ہماری جنت ہی تو ہونے ہیں۔ وہ خوشیاں جو والدین کو دکھ دے کر حاصل کی جاتی ہیں پھر وہ خوشیاں، خوشیاں نہیں رہتیں بددعا بنت جاتی ہیں۔ اور ایسا ہی تو ماما کے ساتھ ہوا تھا۔ نانا ابا ان سے خفا ضرور تھے مگر انہوں نے کبھی بیٹی کو کوئی بددعا نہیں دی ہوگی۔ پھر بھی ماما ساری زندگی ناخوش رہیں۔ ان کے گرد محبت تھی، خوشیاں تھیں، دنیا کی سب سائنس تھی۔ مگر وہ پھر بھی ناخوش تھیں۔ محبت کا وہ محل جو انہوں نے بڑی محبت سے تعمیر کیا تھا اس میں وہ ایک لمحہ بھی خوش نہیں رہیں۔ اس لیے کہ اس محل کی بنیادوں میں ماں باپ کی آہیں، سسکیاں اور آنسو شامل ہو گئے تھے۔

ہم مشرق کی لڑکیاں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ محبت شاید ہمارے بس کا روگ نہیں۔ ہمارا خون خمیر شاید اس جذبے کے لیے موزوں نہیں۔ ہم محبت کر بھی لیں تو اسے بھلا، مشکل۔ اور اگر جھالیں تو زندگی گزارنا مشکل۔ محبت میں ہونے والی وہ لمحہ بھر کی لغزش وہ ایک پل کی نذر غرضی ”مجھے اپنی محبت حاصل کرنی ہے کسی بھی قیمت پر۔“ وہ پھر ہمیں نہ جینے دیتی ہے نہ مرنے دیتی ہے۔ پھر وہ محبت جو ہم نے بہت لڑ کر اور

دبا سے نکلنے کی کوشش کی ہوتی ہے ہمیں اپنا سب سے بڑا گناہ نظر آنے لگتی ہے۔ ایسا گناہ جس پر ہم
 اُستے بیٹھے سوتے جاگتے ہر پہلے شرمندہ ہوتے ہیں۔ ہم محبت کے بغیر رہ سکتے ہیں مگر خود سے وابستہ
 (توں اور محبتوں کے بغیر زندگی گزار ہی نہیں سکتے۔ میں نے ماما کی زندگی سے یہی سبق حاصل کیا ہے۔“

فریاء عبدالرحمان اگر ایک کتاب تھی تو آج سے پہلے انہوں نے صرف اس کا سرورق ہی دیکھ رکھا تھا۔
 آج پہلی مرتبہ وہ اسے ورق ورق پڑھ رہے تھے۔ وہ چھوٹی سی بچی، کل جس کی انگلی تھام کر وہ اپنے ساتھ
 اپن سے پاکستان لائے تھے۔ آج اتنی بڑی ہو گئی تھی۔ اتنی بڑی۔ ان کے قد سے بھی بڑی۔

”اپنے لیے خود تو وہ لڑکیاں سوچتی ہیں جن کے لیے کوئی سوچنے والا نہیں ہوتا۔ میں کوئی لاوارث تو نہیں
 ہر اپنی زندگی کے فیصلے خود کرتی پھروں۔ میرے لیے سوچنے اور فیصلہ کرنے والے اللہ کا شکر ہے موجود
 ہیں۔“

”آپ بتائیں مجھے کہاں ایڈمشن لینا چاہیے۔ جہاں آپ کہیں گے میں وہیں ایڈمشن لوں گی۔“

”آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں نانا ابا! مجھے آپ کے بغیر کچھ اچھا نہیں لگتا۔ نہ کھانا کھانا۔ نہ تیار
 اونا۔ نہ کسی سے ملنا۔“

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے تھے۔

”فری! نانا کی جان تجھ پر قربان۔ فری! اتنا پیار تھا تمہارے دل میں میرے لیے اتنا زیادہ۔ نہیں فری
 میری جان! اپنے بوڑھے نانا کو یوں اپنا زیر بار نہ کرو۔ اسے اس قدر مت چاہو۔ جو کچھ تم نے میرے لیے
 کیا وہ تو میں نے تم سے کبھی مانگا بھی نہیں تھا۔ تم نے وہ قرض اتارے جو تم پر واجب ہی نہیں تھے۔ تم پر
 کوئی قرض نہیں تھا فری۔ تم پر کوئی قرض نہیں تھا۔“

وہ کمر اور بوڑھا نانا، نواسی کی اس محبت اور وفا پر بلک بلک کر رو رہا تھا۔

نہ وہ باپ فاروق احمد کوئی بہت مختلف اور منفرد باپ تھے۔ نہ وہ بیٹی صوفیہاں فاروق کوئی بہت مختلف اور
 منفرد بیٹی تھی۔ سب سے مختلف، سب سے منفرد اور سب سے خاص تو وہ بیٹی اور نواسی فریاء عبدالرحمان تھی۔

ان کا ایک عمر کا تجربہ، ذہانت، علم، مشاہدہ، لوگوں کو لمحہ بھر میں سمجھ لینے اور چہرے پڑھ لینے کا دعویٰ کہیں بہت
 پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ ان کے سامنے کی چھوٹی سی بچی ان کے عمر بھر کے تجربے، علم، ادراک، فہم و فراست اور
 نقل و دواش کو بڑے آرام سے ہراتی ہوئی دگر کھڑی مسکرا رہی تھی۔ انہیں لگا وہ ان سے بہت اونچائی پر
 کھڑی ہے۔ اس کے آگے انہیں اپنا قد بونے جتنا نظر آ رہا تھا۔

”میں خود اس سے یہی کہہ رہی تھی کہ یہ کون سا موقع ہے امریکہ جانے کا۔ لیکن اسے آنٹی، انکل اور

زویب بہت یاد آرہے تھے۔ مجھ سے پکا وعدہ کر کے گیا ہے کہ تمہاری شادی سے پہلے پہلے میں کراہا جاؤں گا۔“
 ان کے کانوں میں اس کی ہنستی مسکراتی آواز گونج رہی تھی۔ اپنی عقل اور تجربے کے زعم میں وہ کبھی چاہا جان ہی نہیں پائے۔

”اچھا سعد امریکہ چلا گیا۔ ہاں وہ امریکہ جاتا آتا رہتا ہی ہے۔“

”اتنے دن لگا دیے واپس نہیں آیا۔ ہاں بھی یہ آج کل کے نوجوانوں کے لیے امریکہ خوابوں کی نگہری اور زمین پر جنت بنا ہوا ہے۔ جسے دیکھو وہیں بھاگنے کی دھن میں لگا ہے۔ ایک طرف یہ نوجوان منہ مہر بھج کر امریکہ کو گالیاں دیتے ہیں۔ اسے مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن قرار دیتے ہیں اور پھر اسی منہ سے امریکن ایمپرسی کے باہر ویزا کے لیے قطار لگائے کھڑے بھی ہوتے ہیں اور سعد تو خوش قسمت ہے اسے تو ویزا کے لیے کسی قطار میں بھی نہیں لگنا تھا۔ پھر وہ یہاں کب تک بیٹھا صاحب الوطنی کے راگ الاپتا۔“
 ”فریاد اس نظر آ رہی ہے۔ وہ سعد کے جانے پر اداس ہے۔ دونوں میں دوستی بھی تو بہت ہے۔ اسے فکر ہو رہی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو سعد شادی پر نہ آئے۔“

ان کی مختلف اوقات میں سوچی گئی باتیں اس وقت تہمتے لگا لگا کر ان پر ہنس رہی تھیں ان کا مضحکہ اڑا رہی تھیں۔

فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ اذان کی آواز سن کر انہوں نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے تھے۔ اب وہ کمرے میں بکھری تمام اشیاء کو واپس ان کی اصل جگہ پر پہنچا رہے تھے۔ تمام چیزیں ان کے اصل مقام پر رکھ دینے کے بعد انہوں نے سب سے آخر میں وہ خط بالکل اسی طرح فولد کر کے جس حالت میں وہ انہیں ملا تھا واپس اسی کتاب کے اندر رکھ دیا تھا۔ اسے یہ پتہ نہ چلے کہ اس کی چیزوں میں کوئی گھسا تھا۔

شادی کی مصروفیات اور افراتفری میں وہ خط کو کسی مناسب جگہ پر رکھنا بھول گئی ہوگی اور اب یقیناً اسے فراغت ملتے ہی پہلی فرصت میں وہ خط یاد آئے گا۔ وہ اسے کسی کی بھی نظروں میں لائے بغیر یا تو جلا ڈالے گی یا کسی ایسی جگہ رکھے گی جہاں کسی دوسرے کے دیکھ لینے کا کوئی خطرہ نہ ہو۔ اس کا بھرم اور اس کی انا نہیں بڑی عزیز تھی۔ اس نے جو کچھ کیا اگر وہ اسے ان سے چھپانا چاہتی ہے تو پھر یوں ہی ٹھیک ہے۔ وہ کبھی اس پر کچھ ظاہر نہیں کریں گے۔ وہ کبھی اسے یہ بات نہیں بتائیں گے کہ انہوں نے اس کا اصل پالیا ہے۔ کل جب وہ اپنے شوہر کے ساتھ ان سے ملنے آئے گی تو ان کا چہرہ دیکھ کر اسے ہلکا سا بھی شکر نہیں ہوگا کہ انہوں نے سب کچھ جان لیا ہے۔

وہ جلدی جلدی نماز کی تیاری کر رہے تھے۔ آج کی یہ نماز ان کے لیے بہت اہم تھی۔ آج انہیں صرف اپنی جان سے عزیز نواسی کی خوشیوں کے لیے ہی دعائیں نہیں مانگنی تھیں بلکہ اپنے اللہ سے بھی اپنے گناہوں کی معافی مانگنی تھی۔ وہ گناہ جو ان جانے میں پچھلے کئی برسوں سے ان سے سرزد ہو رہا تھا۔

”میں تیری اتنی عبادت کرتا ہوں۔ تیرا ہر حکم ماننا ہوں۔ پھر بھی تو نے میرے ساتھ ایسا کیا۔ میری بیٹی مجھ سے چھین لی۔ میں اس سے مل بھی نہ سکا۔ اسے دیکھ بھی نہ سکا۔ اس سے کوئی بات بھی نہ کر سکا۔ اور تو نے اسے ابدی نیند سلا دیا۔ میں تجھے کبھی نہیں بھولا اور تو نے مجھے بھلا دیا۔“

وہ اللہ کے ساتھ اپنی عبادتوں اور نیکیوں کا حساب کتاب کرنے لگے تھے۔ یہ بھول گئے تھے کہ وہ مالک ہے اور وہ خود اس کے عاجز بندے۔ انہیں اس کے ساتھ ضد کرنے کا کوئی حق نہیں۔ انہیں ہر حال میں اس کی رضا میں راضی رہنا ہے۔

”مجھے میری بیٹی چاہیے۔ جب تک وہ نہیں آئے گی میں یونہی روٹھا رہوں گا۔“

ستر سال کا وہ بوڑھا اپنی بچکانہ ضدوں پر شرمسار گیٹ کھول کر باہر نکلا تھا۔ مسجد جانے کے لیے۔ اپنے اللہ سے معافی مانگنے کے لیے۔ اسے منانے کے لیے۔

اب اس گھر میں ضوفشاں فاروق کا نام لیے جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ اب اس کا نام لینے والا کبھی بھی معتوب اور گناہ گار قرار نہیں دیا جاتا تھا۔



”آج اس روئے زمین پر مجھ سے بڑھ کر خوش قسمت دوسرا کوئی انسان نہیں ہو سکتا اور میری دلہن سے زیادہ خوبصورت کسی کی دلہن نہیں ہو سکتی۔“

وہ اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے بڑی گرم جوشی اور محبت سے بھر پور لہجے میں بول رہا تھا۔ سر خوش اور والہانہ پن اس کے ہر ہر انداز سے ظاہر تھا۔ یوں جیسے اس نے نفت اقلیم کی دولت پالی ہو۔ وہ سر جھکائے ہوئے کچھ نروس سی بیٹھی ہوئی تھی۔ حمزہ اس کے اس شرمائے ہوئے انداز کو خوب انجوائے کر رہا تھا۔ میں نے ایک یارمی سے تمہارے بارے میں بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس لڑکی کی صرف شکل ہی میں مغربیت کی جھلک ہے باقی اس کا ہر انداز مشرقی ہے۔“ وہ اس کی طرف جھٹکا ہوا بولا تھا۔

”زیادہ خوش فہمی کا شمار مت ہو۔ اتنی زیادہ مشرقی بھی نہیں ہوں میں۔“ اسی طرح سر جھکائے ہوئے وہ بہت آہستہ سے بولی۔ حمزہ اس جواب پر تہقہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

”یہی بات اگر میری آنکھوں میں دیکھ کر کہتیں تو میں یقین کر بھی لیتا۔“ وہ چھیڑنے والے انداز میں

بولتا تھا۔

”اچھا یہ بتاؤ ہم لوگ ہنی مون کے لیے کہاں چلیں۔ جگہ کا انتخاب تو کرو۔“ کچھ دیر بڑے غور سے اس کی طرف دیکھتے رہے اور اس کے نزد سے انداز کو انجوائے کرنے کے بعد اس نے موضوع تبدیل کیا۔

”اسپین“ اس نے سوچنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگایا تھا۔ اس سے یہ تصدیق بھی نہیں چاہی تھی کہ جہاں وہ کہے گی کیا وہ واقعی اسے وہاں لے بھی جائے گا۔ یوں جیسے اسے یقین تھا کہ حمزہ جو کہہ رہا ہے وہ واقعی کرے گا بھی۔

وہ اس کے منہ سے اسپین کا نام سن کر مسکرایا تھا۔ اگرچہ وہ جانتا تھا کہ فریا اسپین کیوں جانا چاہتی ہے لیکن پھر بھی وہ شرارتی سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔

”ہاں وہاں جانے میں تمہارا بہت فائدہ ہے۔ وہاں تمہیں یہ خطرہ نہیں ہوگا کہ وہاں بکھرے حسن سے متاثر ہو کر میں کسی اسپینش حسینہ پر عاشق ہو جاؤں گا۔“ وہ خود بھی اس کی بات سن کر مسکرا دی۔

”ہاں ایک وجہ یہ بھی ہے۔“

”لڑکی! اپنے شوہر کی شرافت پر شک کر رہی ہو۔ شرم کرو۔“ اس نے مصنوعی خفگی سے اس کی سمت دیکھا۔ وہ اس کی بات پر مسکراتے ہوئے بڑے غور سے اس انگوٹھی کی طرف دیکھ رہی تھی جو ابھی کچھ دیر پہلے حمزہ نے اسے بہت پیار سے پہنائی تھی۔

”آج میں اتنا خوش ہوں فریا! کہ تمہیں بتا نہیں سکتا۔ یہ خوبصورت سادل آج سے میرا ہو گیا۔“

اپنے شوہر کے شانے پر سر رکھے محبت کے گیت سنتی فریا عبدالرحمان کے دل میں دور دور تک پھول ہی پھول کھلے ہوئے تھے۔ کہیں کوئی ملال، کوئی پیچھتاوا دامن گیر نہیں تھا۔

”میری محبت کے محل کی بنیادوں میں کسی کے ارمان اور آرزوئیں نہیں سسک رہیں۔“ وہ اپنے لیے اس کی والہانہ اور شدید محبت کا بے ساختہ اقرار سنتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

”زندگی پھر مجھے موقع دے۔ میں فرض کر لوں کہ مجھے دوسری زندگی ملے۔ فیصلے کا اختیار پھر میرے ہاتھ میں دیا جائے۔ ایک رشتہ یا بہت سے رشتے؟ ایک چاہت یا بہت سی چاہتیں؟ ایک محبت یا بہت سی محبتیں؟ تو میرا انتخاب ہر بار رشتے، چاہتیں اور محبتیں ہی ہوگا۔ میں ہر بار ان ہی کو منتخب کروں گی۔“ اس نے پرسکون سے انداز میں آنکھیں موند لی تھیں۔

